دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
الحق
زیر سرپرستی: شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور (مغربی پاکستان)

لہ دعوۃ الحق

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ
اگست ۱۹۷۰ء

جلد : ۵
شمارہ : ۱۱

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر ـــــــ سمیع الحق

اس شمارے میں

★

بدل اشتراک

مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/- روپے ، فی پرچہ ۷۰ پیسے
غیر ممالک : بحری ڈاک ایک پونڈ ۔ غیر ممالک : ہوائی ڈاک ایک پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

۵ ؍ اکتوبر قریب ہے جو بظاہر انتخابات ملتوی نہ ہونے کی صورت میں انتخابات کا دن ہے۔ پاکستان کی پوری ملتِ مسلمہ کیلئے امتحان اور آزمائش کا دن ...... جس اعلیٰ وارفع مقصد کیلئے ہم نے اللہ سے ایک الگ خطہ مانگا تھا اور جس کیلئے اپنے لاکھوں مسلمان بھائیوں کو شہید کرایا۔ ہزاروں عصمتیں لٹوائیں، کروڑوں گھر اجاڑے اور تقریباً سات کروڑ مسلمانوں کو ظالم اور سفاک ہندو کے رحم وکرم پر زندہ درگور چھوڑ کر پاکستان چلے آئے اور جسکی پاداش میں اب بھی بھارت کی گلیوں کوچوں میں بہنے والا خونِ مسلم پانی سے زیادہ فراوان و ارزاں ہے وہ مقصد کوئی جغرافیائی یا وطنی اور معاشی ہرگز ہرگز نہ تھا۔ جو لوگ ایسا کہہ رہے ہیں وہ اجڑنے اور لٹنے والے اُن عاشقانِ پاک طینت کے ارواحِ طیبہ کا منہ چڑا رہے ہیں جنہوں نے پاکستان کے مطلب و معنیٰ لاالٰہ الا اللہ کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا یا، اپنی معصوم اولاد تک کو تہ تیغ ہوتے دیکھا۔ بہنوں، بیٹیوں، ماؤں کی عصمتوں کے آبگینے اُن کے سامنے چور چور ہوتے رہے۔ مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی بلکہ جوش اور ولولے اور تیز ہوتے گئے۔ اس لئے کہ ان کا منزل اور مقصد ایک ایسی مملکت کا حصول تھا جہاں حاکمیت صرف خدا اور اس کے رسول کی ہوگی۔ وہاں کی معاشرت و معیشت، تہذیب و تمدن اور حکومت وسیاست شریعتِ محمدیہ کی ترجمان ہوگی وہاں ظلم واستبداد اور استحصال کا نہیں بلکہ عدالتِ فاروقیؓ، سیاستِ صدیقیؓ، استغنائے عثمانیؓ اور زہد وقناعت مرتضویؓ کا دور دورہ ہوگا۔

اللہ نے ہمیں وہ سرزمین دے دی، جو مقصد نہیں بلکہ حصولِ مقصد کا وسیلہ تھا۔ مگر ہم نے اللہ کی اس عظیم ترین نعمت آزادی کو جس بے دردی سے پائمال کرتے ہوئے جس ناشکری کا مظاہرہ کیا اس کی نظیر فرعون کے ظلم وستم سے نجات پانے والے اسرائیلیوں کے علاوہ اقوامِ عالم میں کہیں اور نہیں مل سکے گی۔ انہوں نے گوسالہ پرستی کی، ہم نے نفس

اور خواہشات میں مغلوب ہو کر اُن گوسالہ پرستوں کی ملعون تہذیب و تمدن (تہذیب مغرب) کو اپنا معبود و مقصود بنا لیا۔ اور اس راہ میں تہذیب اسلامی اور اخلاق ایمانی کی ہر رکاوٹ کو سنگ گراں سمجھ کر راستہ سے ہٹانے کی سعی کی، شعائر اللہ کی توہین، اسلامی اقدار سے فرار منکرات کی ترویج، معروفات پر پابندی اسلام کے نظام عدل و انصاف سے گریز، غرض وہ کونسی بات ہے جو ۲۳ سال کے اس طویل عرصہ میں ہمارے سیاستدانوں اور برسر اقتدار ٹولوں کا مشغلہ شب و روز نہیں بنی۔

---

۲۳ سال کا عرصہ بہت بڑی مہلت ہے جو خداوند کریم نے اس خود فراموش اور خدا فراموش قوم کو دیا۔ اتنے ہی عرصہ میں اس قوم کے آقا اور مولیٰ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دنیا کی کایا پلٹ دی تھی۔ جاہلیت کے اندھیرے عدل کی روشنی میں بدل گئے تھے اور انسانیت کو قعر مذلت سے اٹھا کر اوج کمال تک پہنچا دیا گیا تھا۔ اتنے ہی عرصہ میں انسانیت کو خداوند کریم نے کتاب وسنت کی شکل میں شریعت بیضاء کی ایک ایسی دولت دی جو قیامت تک اس کی ہر مصیبت کا مداوا ہر پریشانی کا حل اور ہر مشکل کا جواب بن سکتی ہے۔ یہ نسخۂ کیمیا بحیثیت مسلمان اور نبی کریم علیہ السلام کے غلام ہونے کے ہمیں بنا بنایا مل گیا۔ ہم چاہتے تو ایک ہی سال میں اسکی روشنی سے اپنے نوزائیدہ حکومت کو اقوام عالم میں ایک بلند ترین مثالی اور معیاری نمونہ کے طور پر پیش کر سکتے تھے۔ آج وہ نہ صرف بھارت کے مظلوم مسلمانوں کیلئے ایک خدائی حصار ثابت ہوتا بلکہ عالم اسلام کے کسی بھی گوشہ میں ظلم و عدوان کے شکار مسلمان بھائی اسے ظالم اور انسانیت دشمن طاقتوں کے لئے ایک چیلنج سمجھتے وہ یہود کی للکار کا جواب اور قبرص کی مصیبتوں کا علاج ہوتا۔ بلکہ پوری ایشیا کی انسانیت اس کے سہارے سکھ اور چین کا سانس لے سکتی۔ کیا شریعت محمدیہ کے اسی الہامی نسخہ نے اپنی یہ سچائی تاریخ کے مختلف ادوار میں نہیں دکھائی ——؟

مگر ہم نے کیا کیا ——؟ ہر دغاباز ظالم اور منافق کے سنہری دعووں پر لبیک کہتے رہے اور اُسے اقتدار اور آئین کے بام پر بٹھا کر اپنی ذلت اور خود فریبیوں کا تماشا دنیا کو دکھاتے رہے، ہم نے ظالم کو ظلم کا موقع دیا اور اپنے ہاتھوں شریعت محمدیہ آئین اسلامی کے اجراء اور نفاذ کی امیدوں کا ایک ایک چراغ بجھانا چاہا ———— مگر ہمیں اس کی سزا

بہت کچھ مل چکی ہے اور قدرت نے ہماری بے سر و سامانی پر رحم کھا کر اگلے انتخابات کی شکل میں ایک موقع پھر عطا کر دیا ہے۔ یہ صرف عام انتخابات نہیں ہیں بلکہ ہمیں اپنے اور اس ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہ حق و باطل اور شریعت محمدی اور قوانین کفر و الحاد کے درمیان رزم ہے ہم میں سے ہر شخص صرف ووٹ نہیں دیگا بلکہ اسلام اور شریعت غرّاء کی اطاعت یا پھر اس سے بغاوت پر دستخط کرے گا۔ یہ دستخط اللہ کے رجسٹر میں ثبت ہوں گے۔ ان پر آنے والی نسلوں کے ایمان و یقین یا کفر و الحاد کا دار و مدار ہوگا۔ یوم الحساب میں نجات اور ہلاکت کے فیصلے ان دستخطوں کو سامنے رکھ کر کئے جائیں گے۔ اگر ۲۳ سال کی طویل و عریض مدت کا تجربہ بھی ہمیں کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں کرا سکا، ہم اس دفعہ بھی علاقائی، گروہی، خاندانی یا نظریاتی الجھنوں میں پھنسے رہے اور مادی اغراض و مقاصد طمع و لالچ، خوف اور خطرہ، پارٹی اور جماعتوں کی دلدل نے ہمیں جادۂ حق پر گامزن نہ ہونے دیا تو یاد رکھئے اس کا خمیازہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری ملت مسلمہ کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لئے کہ آنے والا الیکشن پورے عالم اسلام کے حق میں، ایشیا کے حق میں، سامراج کے حق میں، ظلم و استحصال کے حق میں، مثبت یا منفی نتائج کا حامل بن سکتا ہے، آئیے ہم سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں اور ووٹ کی اس امانت کو اس کے صحیح موقع اور محل میں استعمال کریں جس سے نازک تر امانت موجودہ دور میں کوئی نہیں اور جس پر پوری ملک و ملت کے لئے آئین سازی کا دار و مدار ہے۔

ہمیں اللہ نے عقل اور فہم و فراست سے نوازا ہے۔ چوپایہ نہیں بنایا — تو آئیے! آج ہی فیصلہ کریں کہ ووٹ کی اس امانت کے اہل وہی لوگ ہوں گے جو راسخ العقیدہ، خدا ترس اور خدا پرست ہوں، احساس ذمہ داری سے ان کا دل بوجھل ہو، محاسبۂ آخرت پر انہیں یقین ہو اور جس کام یعنی شریعت محمدیہ اور آئین اسلامی کی ترتیب و تدوین کے لئے آپ انہیں منتخب کرنا چاہتے ہیں وہ اس نازک اور مشکل ترین ذمہ داری کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں ان کی زندگی کتاب و سنت کے سیکھنے سکھانے میں بسر ہوئی ہو۔ نئے حالات اور نئے تقاضوں پر ان کی نظر گہری ہو، ان کا کردار و عمل ابھی سے مملکت اسلامیہ کے آئین، اسلام کی صداقت کی شہادت دے رہا ہو وہ اپنے قول و عمل میں راستباز ہوں یا پھر آپ کے کسی بھی حلقے سے کھڑے ہونے والے امیدواروں میں وہ ان پاکیزہ صفات کے زیادہ

قریب اور برائیوں سے اوروں کی بہ نسبت زیادہ دور ہوں۔ اگر آپ کے انتخاب کا یہی معیار رہا۔ اور اس راہ میں آپ نے کسی پارٹی کی پرواہ نہ کی، گروہ بندی اور مفاد پرستی کے تمام بندھنوں کو توڑ ڈالا تو آپ اس نازک امتحان میں پورے اتر کر قوم و ملک اور بارگاہِ ایزدی میں سرخرو ہو کر نکلے۔ ورنہ یاد رکھئے کہ آپ کی ذراسی غفلت، بے پروائی اور کوئی بھی ذاتی یا جماعتی خودغرضی کا وبال پوری ملت پاکستان پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اور جس کی لپیٹ سے نہ آپ اس دارِ فانی میں محفوظ رہ سکیں گے، نہ قیامت کے ہولناک دن۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔ سمیع الحق

پچھلے شمارہ میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی علالت کی خبر دی گئی تھی۔ اس دوران بیشمار افراد نے خطوط کے ذریعہ حالات معلوم کئے ہیں، جن کی خدمت میں عرض ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ شوگر اور آنکھوں کی تکلیف بڑھ جانے کیوجہ سے ۲۳ رجون کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور داخل ہوئے۔ ۱ر جولائی کو وہاں دائیں آنکھ کا اپریشن ہوا اور ۳۰ رجولائی کو گھر تشریف لے آئے ہیں۔ بحمداللہ عام صحت قدرے بہتر ہے، آنکھ پہلے سے کالا پانی سے کافی متاثر ہو چکی تھی، اپریشن سے معمولی سا فائدہ ہوا۔ دوران علاج حضرت کے معالجین پشاور کے ماہر و ممتاز ڈاکٹروں جناب ڈاکٹر ناصر الدین اعظم صاحب، جناب ڈاکٹر محمد نواز صاحب آئی سپیشلسٹ اور ہر دو حضرات کے مخلص اور جفاکش معاون ڈاکٹروں نے جس جذبۂ اخلاص وعقیدت سے حضرت کے علاج میں دلچسپی لی۔ خداوند کریم ان کو اس کا اجر عطا فرمادے۔ اس طرح جتنے حضرات دور دراز سے بار بار تیمار داری کیلئے آئے، پورا حلقۂ دارالعلوم ان کا شکر گذار ہے۔ بحمداللہ حضرت مدظلہ دارالعلوم تشریف لاکر درس و تدریس کے مشاغل میں مصروف ہو چکے ہیں۔ (سلطان محمود ناظم دفتر اہتمام)

دعائے صحت کی درخواست

ہندوستان کے ممتاز محقق، فلسفی اور عارف بزرگ مولانا عبدالباری ندوی صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی دکن، کافی دنوں سے علیل ہیں۔ تمام قارئین سے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

تحریر : علامہ محمد اسد
ترجمہ : محمد معین خان بی۔ اے (عثمانیہ)

اسلامی اور مغربی

تہذیب کا بنیادی فرق

علامہ محمد اسد کی کتاب کی مزید اور آخری قسط پیش خدمت ہے۔ یہ کتاب کے دوسرے باب THE SPIRIT OF THE WEST کا ترجمہ ہے۔ پہلے باب کی طرح اس باب میں بھی مصنف نے کہیں بڑی ادق اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مضمون اگرچہ خاصا طویل ہے لیکن بہت ہی سیر حاصل ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے سبق آموز ہے۔ جو اپنی مرعوب ذہنیت کے زیر اثر اپنی مشکلات کا حل مغربی تہذیب میں تلاش کرنے پر مصر ہیں۔ مغربی تہذیب ایک خبیث روح ہے جس سے چمٹ جاتی ہے اس کا ستیاناس کر دیتی ہے اس کی سب سے پہلی اور سب سے کاری ضرب نظریۂ حیات (IDEALOGY) پر پڑتی ہے اور نظریۂ حیات کی تباہی سے قوموں کا جو حشر ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ ——— محمد معین خان ———

★

گذشتہ باب میں اسلام کی اخلاقی بنیادوں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ اس سے ہمیں یہ آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی تہذیب حکومت الٰہیہ (THEOCRACY) کی ایک ایسی مکمل ترین صورت ہے کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہاں مذہبی لحاظ ہر شے میں مضمر اور ہر چیز سے بالا ہے۔ اس تہذیب کا اگر مغربی تہذیب کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان دونوں کے نظریات میں فرق و اختلاف کی ایک وسیع خلیج نظر آئے گی۔

جدید مغرب کی سرگرمیاں اور کوششیں صرف عملی افادہ اور حرکت انگیز پھیلاؤ (DYNAMIC EXPENSION)

کے ملحوظات کے تابع ہوتی ہیں۔ زندگی سے اسکی اپنی اخلاقی صداقت (MORAL REALITY) منسوب کئے بغیر اسکی امکانی قوتوں کو دریافت کرنا اور ان قوتوں کے تجربے کرنا اس تہذیب کا اصل مدعا ہے۔ عرصہ ہوا کہ جدید یورپی یا امریکی کے نزدیک زندگی کے معنی و مقصد کے سوال کی قطعاً کوئی عملی اہمیت نہیں رہی۔ اگر اہمیت ہے تو صرف اس سوال کی کہ زندگی کون کون سی شکلیں اختیار کر سکتی ہے؟ کیا نسلِ انسانی فطرت کی مکمل تسخیر کی جانب بڑھ رہی ہے؟ مابعد الذکر سوال کے بارہ میں جدید مغربی کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ لہٰذا وہ اس بارہ میں اسلام سے متفق نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں آدم اور اولادِ آدم کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً

اس کا بدیہی مفہوم یہی ہے کہ انسان کو زمین پر حکومت اور ترقی کرنے کے لئے مامور کیا گیا ہے لیکن انسانی ترقی کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، اس کے متعلق اسلامی اور مغربی نقاطِ نظر میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔

جدید مغرب اس بات کا قائل ہے کہ نوعِ انسانی عملی حاصلات (PRACTICAL ACHIEVEMENTS) اور سائینسی فروغ کے ذریعہ ایک ارتقاء پذیر روحانی اصلاح و ترقی سے شادکام ہو سکتی ہے۔ اور اسلام مغرب کے اس مادہ پرستانہ حرکت انگیز تصور انسانیت ———— (METERIALISTICALLY - DYNAMIC CONCEPTION OF HUMANITY) کا یکسر مخالف ہے۔ اسلام ذاتِ مجموعی یعنی نوعِ انسانی کے روحانی ممکنات کو ایک سکونی کمیت (STATIC QUANTITY) قرار دیتا ہے۔ مغرب کے پاس یہ بات مسلمہ ہے کہ فطرتِ انسانی ایک تدریجی تغیر و ترقی کے عمل سے ایسی ہی گذر رہی ہے، جیسے ایک پودا پروان چڑھتا ہے۔ لیکن اسلام نے اس بات کو کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ اس لئے کہ فطرت مذکور یعنی روحِ انسانی کسی حیاتیاتی کمیت پر مؤسس نہیں ہے۔ فلسفۂ یورپ مادی علم و آسائش کی ترقی اور روحانی و اخلاقی ارتقاء کو ایک جیسا قرار دینے میں جس بنیادی غلطی کا مرتکب ہوا ہے اس کا سبب ایک ایسی ہی بنیادی غلطی ہے جو اس فلسفہ سے حیاتیاتی ضابطوں کو غیر حیاتیاتی حقائق پر منطبق کرنے کے معاملہ میں سرزد ہوئی ہے۔ اس تصور کی تہہ میں وجودِ روح سے جدید مغرب کا انکار مضمر ہے۔ اسلام جو ماورائی تصورات پر مبنی ہے۔ روح کو ایک ایسی حقیقت سمجھتا ہے جو ریب و شک یا قیل و قال سے بالا ہے۔ مادی ترقی اور روحانی ترقی اگرچہ ایک دوسرے کی مخالف تو نہیں ہیں لیکن وہ ایک جیسی

بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ دونوں حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے پر انحصار کرنا بھی لازمی نہیں ہے۔ دونوں ایک ساتھ فروغ تو پا سکتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔

اسلام جہاں نوعِ انسانی بہ حیثیت ہیئت اجتماعی کی خارجی یعنی مادی ترقی کے امکان کو واضح طور پر تسلیم کرتا ہے بلکہ شد و مد کے ساتھ اس کا اعلان بھی کرتا ہے، وہاں وہ اس امکان کا صاف صاف لفظوں میں انکار کرتا ہے کہ نوعِ انسانی اپنی مجموعی حاصلات ——— (COLLECTIVE ACHIEVEMENTS) کے ذریعہ کسی روحانی ترقی سے من حیث المجموع ہم کنار ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روحانی ترقی کا حرکت انگیز عنصر صرف فرد کی ذات تک محدود ہوتا ہے لہٰذا ہمارا ایک ہیئت اجتماعی کی صورت میں کاملیت (PERFECTION) کی جانب قدم بڑھانا قطعاً ناممکن ہے۔ بریں بناء ہم میں سے ہر ایک کو اپنے روحانی مقصود کے حصول کے لئے ایک فرد کی حیثیت سے کوشش کرنا ہو گی۔ ہر ایک کو خود ہی اس کوشش کی ابتداء بھی کرنا ہو گی اور خود ہی اسے اتمام تک پہنچانا بھی ہو گا۔

انسان کے روحانی مقدرات کے بارہ میں اس صریح انفرادیت پسندانہ نظریہ کو معہ اور معاشرتی اشتراک کے اسلامی تصوّر کے ذریعہ متوازن بنا دیا گیا ہے۔ اس تصوّر کی روح سے معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی خارجی زندگی کو کچھ اس انداز سے ترتیب دے کہ ہر فرد کو اس کی اپنی روحانی مساعی میں کم سے کم مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑے اور زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی میسّر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامی حیاتِ انسانی کے روحانی پہلو سے بھی اتنا ہی تعلق رکھتی ہے جتنا کہ اُس کے مادی پہلو سے۔ نیز یہ شریعت زندگی کے انفرادی اور معاشرتی دونوں پہلوؤں کو بھی محیط ہے۔

اُس قسم کا تصور صرف روحِ انسانی کے وجود اور نتیجۃً حیاتِ انسانی کے ماورائی مقصد کے بارہ میں ایجابی یقین کی بنیاد پر ہی تشکیل پا سکتا ہے۔ لیکن جدید مغربی جو وجودِ روح کا پوری طرح قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک مقصدِ حیات کی قطعاً کوئی عملی اہمیت نہیں ہے۔ تمام ماورائی قیاسات اور ملحوظات (TRANSCENDENTAL SPECULATION AND CONSIDERATION) کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

جس چیز کو ہم مذہبی رویہ (RELIGIOUS ATTITUDE) کہتے ہیں وہ ہمیشہ اس یقین پر مبنی

ہوتا ہے کہ دنیا میں اخلاق کا ایک ہمہ گیر ماورائی قانون موجود ہے اور اس قانون کی اطاعت نوعِ بشر کو لازم ہے۔ لیکن جدید مغربی تہذیب معاشی، معاشرتی یا قومی تقاضوں کے سوا کسی اور چیز کے آگے انسان کے سر اطاعت خم کرنے کی ضرورت تسلیم نہیں کرتی ـــ اس تہذیب کا حقیقی معبود روحانی نہیں بلکہ مادّی ہے اور وہ ہے آسائشِ حیات۔ اس کا اصل فلسفہ عزم للقوۃ برائے قوت (WILL TO POWER FOR POWER) میں مظہر ہے۔ یہ دونوں چیزیں اسے قدیم رومی تہذیب سے ورثہ میں ملی ہیں۔

یہاں رومی تہذیب کا جو اس انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ جدید مغرب کی مادہ پرستی کی یہی ذمہ دار ہے۔ شائد ان لوگوں کو کچھ عجیب سا لگے جو قدیم اسلامی شہنشاہیت کے ساتھ رومی شہنشاہیّت کی مماثلت کے تذکرے بار بار سنتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ماضی میں رومی شہنشاہیّت اور اسلامی شہنشاہیّت کے سیاسی نظام ہم رشتہ تھے تو اسلام اور مغرب جدید کے بنیادی تصورات کے مابین اس قدر صریح تفاوت و اختلاف کیوں ہے؟ جواب بالکل سیدھا سادا ہے۔ ان دونوں شہنشاہتوں کے مابین فی الحقیقت کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ رہ گئی وہ مشہور عام مماثلت جس کے آئے دن تذکرے ہوتے رہتے ہیں، سو وہ ایسی فرسودہ اور ساقط الاعتبار تاریخی روایتوں پر مبنی ہے جن کے ذریعہ موجودہ نسلوں کے ذہنوں کو سطحی اور ادھوری معلومات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسلامی اور رومی شہنشاہتوں کے درمیان قطعاً کوئی چیز مشترک نہ تھی بجز اس حقیقت کے کہ یہ دونوں شہنشاہتیں وسیع و عریض سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں اور مختلف قومیں ان کے زیر نگیں تھیں۔ جب تک یہ شہنشاہتیں منصۂ شہود پر باقی رہیں۔ ایسی محرک قوتیں (MOTIVE FORCES) ان کی رہنمائی کرتی رہیں جو ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھیں اور ان سے تاریخ کے بالکلیہ متضاد مقاصد پورے کراتی رہیں۔ مزید براں اگر شکلیاتی (MORPHOLOGICAL) زاویۂ نگاہ سے ان دونوں شہنشاہتوں کا جائزہ لیا جائے تو بھی ہمیں ان کے درمیان وسیع فرق نظر آئے گا۔ رومی شہنشاہیت کو اپنے انتہائی جغرافیائی حدود تک پھیلنے اور سیاسی بلوغت کو پہنچنے کے لئے تقریباً ایک ہزار سال لگے۔ درآنحالیکہ اسلامی شہنشاہیت کا پودا تقریباً اسی سال کی مختصر سی مدّت کے اندر ہی اندر زمین وجود سے اگا اور پوری بہار کو پہنچ گیا۔ جہاں تک ان شہنشاہتوں کے زوال کا تعلق ہے۔ اس میں ان کا باہمی فرق اور بھی زیادہ واضح نظر آتا

ہے۔ رومی شہنشاہیت کا زوال صرف ایک صدی کے اندر ہی اندر اپنے تمام مدارج طے کر گیا تھا۔ انجام کار ہنوں اور گاتھوں کی ترکِ وطنی نے اس شہنشاہیت کی قسمت پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔ یہ زوال اس قدر مکمل ہوا کہ زمانہ نے اس شہنشاہیت کے ادبی اور تعمیراتی کارناموں کے سوا اور کسی نقش کو صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہنے دیا۔ بازنطینی شہنشاہیت عام طور سے رومی شہنشاہیت کی وارث قرار دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس پر وارث ہونے کا اطلاق صرف انہی معنی میں ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے علاقوں پر اس کا پرچم اقتدار لہراتا تھا جو کسی زمانہ میں رومی شہنشاہیت کے زیرِ نگیں رہ چکے تھے ورنہ اس کے معاشرتی ڈھانچہ اور سیاسی نظام کو رومہ کی ہیئتِ سیاسیہ سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ دوسری طرف اسلامی شہنشاہیت جس صورت میں کہ وہ پیکرِ خلافت میں نظر آتی ہے، اگرچہ اپنے طویل دورِ حیات میں متعدد تنزلات اور خاندانی تبدلات سے دوچار ہوتی رہی۔ لیکن اس کا ڈھانچہ بنیادی طور پر ایک ہی سا رہا۔

جہاں تک بیرونی حملوں کا تعلق ہے، مغلوں کی تاخت و تاراج بھی ـــــ یہ اس سے بھی زیادہ شدید تھی جو رومی شہنشاہیت کو ہنوں اور گاتھوں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑی تھی ـــــ مسلمانوں کے معاشرتی نظام اور سلطنتِ خلفاء کے سیاسی وجود کی سالمیت کو متزلزل نہ کر سکی۔ گو کہ ازمنۂ مابعد میں سلطنتِ اسلامیہ کے معاشی جمود اور ذہنی تعطل میں اس تاخت و تاراج کے اثر کا بڑا حصّہ رہا۔ اس ایک صدی کے مقابلہ میں جو رومی سلطنت کو منہدم و برباد کرنے کے لئے درکار ہوئی تھی، خلفاء کی اسلامی سلطنت کی تباہی کے لئے ایک ہزار سال درکار ہوئے تاآنکہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کی صورت میں اس شہنشاہیت کا سیاسی زوال ایک حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی معاشرتی انتشار کے ایسے ایسے نقوش ابھرنے شروع ہوئے جنہیں آج بھی ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

ان تمام واقعات کو دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نوعِ انسانی آج تک جتنے بھی معاشرتی نظاموں کے تجربے کر چکی ہے، اسلام کا معاشرتی نظام کیا بلحاظ باطنی طاقت کے اور کیا بلحاظ سماجی صحت کے ان سب سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ تھا۔ حتیٰ کہ چینی تہذیب جو صدیوں تک دفاع و مفاومت کی ایسی ہی قوتوں کا مظاہرہ کرتی رہی ہے، وہ بھی اس قابل نہیں ہے کہ یہاں مماثلت کے طور پر پیش کی جا سکے۔ چین ایک برّاعظم کے آخری کنارہ پر

واقع ہے اور نصف صدی قبل تک ـــــ یعنی جدید جاپان کے عروج تک ـــــ وہ ہر حریف طاقت کی رسائی سے دور ہی رہا۔ چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کے عہد میں مغلوں کے ساتھ چینیوں کی جو لڑائیاں ہوئی ہیں وہ چینی شہنشاہیت کے حاشیوں سے آگے بڑھنے نہیں پائی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس اسلامی شہنشاہیت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور ہر زمانہ میں قوی اور رشہ زور دشمنوں سے گھری رہی۔

مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کا علاقہ طلوعِ صبحِ تاریخ ہی سے متحارب نسلوں اور ثقافتی توانائیوں کا شعلہ زار مرکز بنا رہا۔ لیکن اسلام کے معاشرتی نظام نے اپنے مخالف عناصر کے مقابلہ میں جو مقاومت پیش کی اسے کبھی یا کم از کم حال حال تک زیر نہیں کیا جا سکا۔ تاریخ کے اس حیرت انگیز منظر کی تشریح کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ یہ دراصل قرآن پاک کی تعلیم تھی جس نے اسلامی معاشرہ کو ٹھوس بنیاد عطا کی تھی اور یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ زندگی تھا جو اس عظیم الشان معاشرتی نظام کے اطراف ایک فولادی حصار بنا رہا۔ لیکن رومی شہنشاہیت کو ایسا کوئی روحانی عنصر نصیب نہ ہوا تھا جو اس کی سالمیت کی حفاظت کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہنشاہیت اس قدر تیزی کے ساتھ پارہ پارہ ہو گئی۔

اسلامی اور رومی شہنشاہیتوں میں ایک فرق اور بھی تھا۔ اسلامی شہنشاہیت کے کے اندر کسی استحقاقی قوم یا گروہ کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ اور حکومت و اقتدار ایک ایسے تصوّر کی تبلیغ و اشاعت کے تابع کر دئے گئے تھے ۔ جسے اس کے علم بردار مذہب کی رفیع الشان سچائی گردانتے تھے ۔ اس کے برخلاف جو تصور رومی شہنشاہیت کی رگ و پے میں جاری و ساری تھا وہ تسخیر قوت اور صرف مادرِ وطن کے مفاد کی خاطر دوسری اقوام سے استحصال ناجائز کا تصور تھا۔ رومی شہنشاہیت میں ایک استحقاقی گروہ تھا، جس کے لئے بہتر سے بہتر آسائش حیات فراہم کرنے کی خاطر رومیوں کے نزدیک ہر تشدد جائز اور ہر ناانصافی روا تھی۔ مشہور زمانہ " رومن انصاف " صرف رومیوں کے حق میں انصاف تھا۔ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ اس قسم کا رویّہ تو زندگی اور تہذیب کے ایک بالکلیہ مادہ پرستانہ تصوّر کی بنیاد پر متشکل ہو سکتا تھا ـــــ ایسی مادہ پرستی جسے ذوقِ تعقل نے نفاست و شائستگی تو بخش دی تھی لیکن وہ تمام روحانی قدروں سے بیگانہ تھی۔ اہلِ رومہ مذہب

سے کبھی آشنا ہی نہ ہوئے تھے۔ ان کے روائتی دیوتا یونانی دیوتاؤں کے مٹے مٹے سے چربے تھے ــــ نحیف وناتواں بھوت پریت جنہیں معاشرتی ریت رسم کے مفاد کی خاطر بلاچوں وچرا تسلیم کرلیا گیا تھا۔ ان دیوتاؤں کو "حقیقی" زندگی میں کسی قسم کی مداخلت کی کوئی اجازت ہی نہ تھی۔ جب کبھی ان سے کوئی حاجت طلب کی جاتی تو وہ حاجت مندوں کو اپنے پروہتوں کی وساطت سے مبہم قسم کے جوابات دیدیا کرتے تھے۔ ان کے بارہ میں کبھی یہ سوچا ہی نہیں گیا کہ یہ انسانوں کو کوئی ضابطۂ اخلاق بھی دے سکتے ہیں۔ یا ان کے اعمال کی رہنمائی کرسکتے ہیں

یہ تھی وہ زمین جس سے جدید مغربی تہذیب کا پودا اگا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تہذیب نے اپنے دوران فروغ میں دوسرے کئی اثرات بھی قبول کئے ہیں۔ اور قدرتی طور پر رومہ کے ثقافتی ورثہ کے متعدد پہلوؤں میں تبدیلیاں اور ترمیمیں بھی کی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ آج مغربی اخلاقیات اور نظریۂ حیات میں جو بھی چیز حقیقی نظر آتی ہے۔ اس کا سلسلہ براہ راست رومی تہذیب سے جاملتا ہے۔ چونکہ قدیم رومہ کی ذہنی اور معاشرتی فضا بالکلیہ افادیت پسندانہ اور مذہب دشمن تھی ــــ علی الظاہر نہ سہی فی الحقیقت ضرور ــــ اس لئے مغرب جدید کی فضا بھی اسی رنگ سے رنگین ہے۔ ماورائی مذہب کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کئے بغیر اور اس ثبوت کی ضرورت کو تسلیم کئے بغیر جدید مغربی فلسفہ ماورائی اخلاقیات کو بالعموم عملی غور وتامل کی حدوں سے پرے چھوڑ دیتا ہے۔ گوکہ یہ فلسفہ مذہب کے ساتھ رواداری بھی برتتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس پر ایک معاشرتی ریت رسم کی حیثیت سے زور بھی دیدیا کرتا ہے۔ مغربی تہذیب اگرچہ شدت کے ساتھ خدا کا انکار تو نہیں کرتی لیکن اس کے موجودہ ذہنی نظام میں خدا کا نہ تو کوئی مقام ہے اور نہ اس نام کے استعمال کی کوئی گنجائش ہی ہے۔ اس تہذیب نے انسان کی ایک ذہنی دشواری ــــ کلیت حیات (TOTALITY OF LIFE) کو ادراک کرنے کی عدم استطاعت ــــ کو نیکی کا رنگ دیدیا ہے۔ پس جدید مغرب صرف انہی تصوّرات کو عملی اہمیت دیتا نظر آتا ہے جو تجربی علوم کے دائرے میں آتے ہیں یا کم ازکم جو انسان کے معاشرتی تعلقات پر محسوس طریقہ سے اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ چونکہ وجود باری تعالیٰ کا مسئلہ ان ہردو زمروں سے بادی النظر میں کوئی تعلق نہیں رکھتا اس لئے مغربی ذہن خدا کو اصولاً عملی

غور و تامل کی اقلیم سے خارج کرنے پہ مائل ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا رویہ مسیحی طریق فکر کے مطابق کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا مسیحیت — جو مغربی تہذیب کا روحانی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے — ماورائی اخلاقیات پر مبنی دین نہیں ہے؟ یقیناً مسیحیت ایک ایسا ہی دین ہے۔ لیکن مغربی تہذیب کو مسیحیت کا ثمرہ سمجھ لینا بڑی فاش غلطی ہوگی۔ مغرب جدید کی ذہنی بنیادیں آپ کو روما کے قدیم تصور میں ملیں گی کہ زندگی ایک خالص افادیت پسندانہ قضیہ (UTILITARIAN PROPOSITION) ہے جس کا کوئی ماورائی پیش نظر (OUT LOOK) نہیں ہے۔ روما کے اس تصور حیات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ "چونکہ حیات انسانی کی ابتداء اور جسمانی موت کے بعد اس حیات کے مقدرات کے بارہ میں ہم — سائنسی تجربات اور قیاسات کے ذریعہ — حتمی طور پر کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی تمام تر توانائیوں کو اپنے مادی اور ذہنی ممکنات کے فروغ و ترقی پر مرکوز کر دیں اور ماورائی اخلاقیات اور اخلاق کے ان مسلمہ اصولوں کو جو مفروضات پر مبنی ہیں اور سائنسی ثبوت کو چیلنج کرتے ہیں۔ اپنی راہ میں حائل ہونے کا کوئی موقع نہ دیں۔"

بلاشبہ مغربی تہذیب کا یہ مخصوص انداز فکر مسیحیت کے لئے اتنا ہی ناقابل قبول ہے جتنا کہ خود اسلام یا کسی اور مذہب کے لئے۔ کیونکہ اسکی اصل ہی ملحدانہ ہے۔ لہٰذا جدید مغربی تہذیب کے عملی کارناموں کو مسیحی اثر سے منسوب کرنا انتہائی جہل اور مضحکہ خیز بات ہوگی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس عظیم سائنسی اور مادی فروغ میں جس کی بدولت مغرب کی موجودہ تہذیب تمام تہذیبوں کے مقابلہ میں فائق و سربلند نظر آرہی ہے۔ مسیحیت نے جو حصہ ادا کیا ہے وہ نہایت ہی معمولی اور حقیر سا تھا۔ مغرب کے تمام علمی و عملی کارنامے درحقیقت اس ذہنی جنگ کے نتیجے ہیں جو یورپ مسیحی کلیسا اور اس کے نظریہ حیات کے خلاف قرن ہا قرن تک لڑتا رہا۔

صدیوں تک روح یورپ ایک ایسے مذہبی نظام کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی رہی جس کے تار و پود میں تحقیر فطرت کا عنصر شامل تھا۔ ترک دنیا یا رہبانیت کی تلقین جس کے سروں سے اناجیل کی ساری فضا گونج رہی ہے، ظلم و زیادتی کے آگے چپ چاپ سرنگوں ہو جانے کا مطالبہ، جنس سے کراہت (گویا یہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جسکی بنیاد اس معصیت

پر قائم ہے جس کے آدم و حوا جنت میں مرتکب ہوئے تھے) ازلی گناہ اور تصلیب مسیح کے ذریعہ اس گناہ کا کفارہ ---- یہ ساری باتیں حیات انسانی کی ایسی تعبیر کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ گویا وہ کوئی ایسی منزل نہیں بلکہ قریب قریب ایک ناگزیر برائی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا عقیدہ دنیاوی معلومات کے حصول اور دنیاوی زندگی کے احوال کی اصلاح و ترقی کی سرگرم کوششوں کی حمایت نہیں کرتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وجود انسانی کے بارہ میں اس ناپاک تصور نے عقل یورپ کو زمانہ دراز تک اپنا مطیع و منقاد بنائے رکھا تھا۔ قرون وسطیٰ کے دوران جبکہ اس سرے سے اس سرے تک مسیحی کلیسا کی مطلق العنانیت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ سائنسی تحقیقات کی اقلیم میں یورپ کا نہ تو کوئی جائے مذار وجود ہی تھا۔ اور نہ کوئی مقام۔ حالانکہ یونان و رومہ کے وہ فلسفیانہ کارنامے جنہوں نے یوروپی ثقافت کو خلعت وجود عطا کیا تھا۔ ان سے بھی یورپ کا حقیقی رشتہ ناتہ ٹوٹ چکا تھا۔ عقل یورپ بار بار بغاوت کرتی رہی اور کلیسا نے ہر بار اس بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ عقل یورپ اور روح کلیسا کی خون آشام آویزشوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔

یورپی ذہن کو عقل کی ان بندشوں سے جو مسیحی کلیسا نے اس پر عائد کر رکھی تھیں۔ نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں آزادی نصیب ہوئی تھی اور یہ آزادی بڑی حد تک ان نئے ثقافتی محرکات اور تصورات کی رہین منت تھی، جنہیں مسلمان عرب کئی صدیوں سے مغرب کو منتقل کرتے چلے آرہے تھے۔

یونان قدیم اور متاخر ھیلانیاتی (HELLINISTIC) ثقافت کی جو بھی چیز سب سے عمدہ نظر آئی عربوں نے اسے متقدم اسلامی شہنشاہیت کے قیام کے بعد کی صدیوں کے دوران نہ صرف اپنی آموزش میں جان تازہ سے نوازا بلکہ اسکو بیش بہا اضافوں سے آراستہ بھی کیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلامی فلسفہ میں ھیلانیاتی فلسفہ کا انجذاب مسلمانوں کے حق میں سرتاسر مفید ثابت ہوا۔ لیکن نونشاۃ ھیلانیاتی ثقافت (REVIVED HELLINISTIC CULTURE)

جہاں ایک طرف اسلامی الہٰیات و فقہ میں ارسطاطالیسی اور نو افلاطونی فلسفہ کو شامل کر کے مسلمانوں کے حق میں نزول آفات کا سبب بنی تو دوسری طرف وہ عربوں کی وساطت سے یورپ کے حق میں زبردست مہیج و محرک کا پارٹ ادا کر کے موجب برکات ثابت

ہوئی۔ قرونِ وسطیٰ نے یورپ کی پیدا۔ رقوتوں کو تاراج کر رکھا تھا۔ علوم معطل ہو چکے تھے۔ توہمات کا سکہ رواں تھا۔ سماجی زندگی اس قدر پست و ناشائستہ تھی کہ آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے وقت عالمِ اسلام کے ثقافتی اثر نے ـــــ ابتداً مشرق میں صلیبی معرکوں اور مغرب میں مسلم اسپین کی شاندار جامعات کے ذریعہ اور بعدہٗ بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات کے توسط سے جو جینوا اور وینس کی جمہوریتوں نے قائم کئے تھے ـــــ یورپی تہذیب کے مقفل دروازوں پر ہتھوڑے برسانے شروع کر دئیے۔ یورپی عالموں اور مفکروں کی چندھیائی ہوئی آنکھوں کے سامنے اب ایک نئی تہذیب جلوہ نما تھی، نفیس و پاکیزہ ترقی پذیر پُر شوق زندگی سے بھرپور، ثقافت کے ان خزینوں کی مایہ دار، جنہیں یورپ عرصۂ دراز قبل ضائع اور فراموش کر چکا تھا۔ عربوں نے جو کچھ کیا وہ یونانِ قدیم کے علوم کا محض احیاء ہی نہ تھا، بلکہ ان کا کارنامہ اس سے بھی کہیں زیادہ عظیم الشان تھا۔ عربوں نے خاص اپنی ایک بالکل ہی جدید سائنسی دنیا تخلیق کی اور فکر و تحقیق کی ایسی ایسی راہوں کو سنوارا، دنیا جن سے اس وقت تک محض لاعلم تھی۔ پھر انہوں نے علم و تحقیق کو یہ سرمایہ دنیائے یورپ کو مختلف راستوں سے منتقل کیا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس جدید سائنسی دور میں آج ہم رہ رہے ہیں اسکی رسمِ افتتاح مسیحی یورپ کے شہروں میں نہیں بلکہ دمشق، بغداد، قاہرہ، قرطبہ، نیشاپور اور سمرقند جیسے اسلامی مرکزوں میں ادا ہوئی تھی۔

اسلام کے ثقافتی اثر نے حیاتِ یورپ پر بڑے گہرے نقش بٹھائے۔ اسلامی تہذیب کی آمد سے آسمانِ مغرب پر عقل و خرد کی ایک نئی روشنی پھیل گئی۔ اس تہذیب نے یورپ کو ایک نئی زندگی بخشی اور ایک نئے جذبۂ ترقی سے سرشار کیا۔ یورپی مورخین اس دور کو قدر شناسانہ انداز میں "نشاۃ ثانیہ" کا جو نام دیتے ہیں اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ علوم ہی کا نہیں بلکہ خود یورپ کا احیاء تھا۔ (باقی آئندہ)
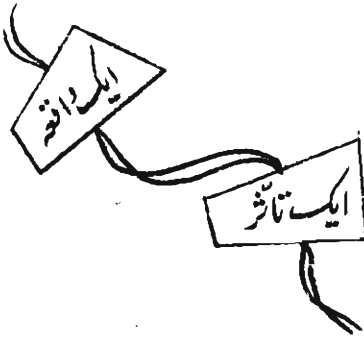
۱۳۶۷ھ میں میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خاص دار العلوم دیوبند نے وفات سے تقریباً پندرہ بیس دن قبل مجھے خلوت میں طلب فرمایا۔ حضرت مرحوم دار المشورہ دار العلوم دیوبند کے مشرقی برآمدے میں تشریف فرما تھے۔ جہاں آج میری نشست ہے۔ میں حسب الحکم حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی غیر معمولی طور پر آبدیدہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ وفور گریہ کی وجہ سے چند منٹ تک بات بھی نہ کر سکے۔ مجھے پریشانی یہ ہوئی کہ کہیں مجھ سے تو ناگواری پیش نہیں آئی۔ اس لئے میں نے کلام میں ابتدا کرتے ہوئے عرض کیا کہ مجھ سے تو کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے یہ تاثیر ہے۔ فرمایا: نہیں بلکہ مجھے یہ کہنا ہے کہ میرا وقت آگیا ہے اور بہت تھوڑا وقفہ باقی رہ گیا ہے۔ مجھے اس وقت یہ واقعہ سنانا ہے کہ جب میں قرآن کا حافظ ہو چکا تو حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) بے حد مسرور تھے اور اس ختم قرآن کی خوشی میں ایک زبردست ولیمہ کیا۔ ذبیحہ کرایا۔ عمائد شہر کو اور اعزا و احباب کے ایک بڑے مجمع کی لمبی چوڑی دعوت کی۔

یہ دن حضرت کے لئے یوم عید بنا ہوا تھا۔ چہرہ خوشی سے روشن تھا۔ اور غیر معمولی طور پر بشاش تھے۔ تقریب سے فارغ ہو کر مجھے خلوت میں طلب فرمایا۔ جس طرح میں نے تمہیں اس وقت بلایا ہے اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا میاں احمد خدا کا شکر ہے کہ تم حافظ ہو گئے۔ وقت آئے گا کہ تم عالم بھی ہو گے۔ تمہاری عزت بھی ہو گی، ملک میں تمہاری شہرت بھی ہو گی اور تمہیں دولت بھی میسر آئے گی۔ لیکن یہ سب چیزیں تمہارے لئے ہوں گی۔ قرآن میں

نے تمہیں اپنے لئے یاد کروایا ہے۔ مجھے فراموش نہ کرنا۔ اور فرمایا: اور آج کا دن ہے یہ میرا دوامی عمل ہے۔ میں ہمیشہ دو پارے یومیہ حضرت قبلہ کو ایصالِ ثواب کی نیت سے پڑھتا ہوں۔ الحمدللہ آج تک ناغہ نہیں ہوا۔

یہ واقعہ سنا کر مجھ سے فرمایا، میاں طیب الحمدللہ تم حافظ ہو چکے ہو، خدا کا شکر ہے کہ عالم بھی ہو چکے ہو۔ وقت آئے گا تمہاری عزت بھی ہوگی، شہرت بھی ہوگی اور حق تعالیٰ تمہیں دولت بھی بہت کچھ عطا فرمائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ تمہارے لئے ہوگا۔ یہ قرآن میں نے تمہیں اپنے لئے حفظ کرایا ہے مجھے فراموش نہ کرنا۔

میں اسی دن پہلے اسی وقت بلوچستان کے طویل سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ یہ واقعہ آٹھ بجے دن کا ہے اور میں دس بجے کی گاڑی سے بلوچستان روانہ ہو گیا۔ دل میں یہ بات جم چکی تھی اور اپنے قلب میں اس نصیحت اور وصیت پر عمل پیرا ہونے کا عزم باندھ لیا تھا۔ اسی سفر غالباً (کوئٹہ) میں اخبارات میں پڑھا کہ حضرت مرحوم حیدر آباد (دکن) کے سفر پر روانہ ہو گئے، جس کا میری روانگی کے وقت مجھے تو کیا حضرت مرحوم کو بھی تصور نہ تھا۔ اچانک ہی بمصالح دار العلوم یہ سفر طے ہوا اور روانگی عمل میں آگئی۔

میں دس بارہ دن کے بعد دیوبند واپس ہوا تو اس وقت تک حضرت مرحوم کی واپسی نہ ہوئی تھی۔ چار چھ دن کے بعد تار سے اچانک وفات کی اطلاع ملی۔ مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ آنے والے مہینے کی پہلی تاریخ سے ہی میں نے حضرت مرحوم کی نصیحت بلکہ وصیت کے مطابق مغرب کے بعد اوابین میں ایک پارہ یومیہ پڑھنے اور حضرت مرحوم کو ایصالِ ثواب کرنے کا معمول بنا لیا۔ جو کہ الحمدللہ آج تک جاری ہے اور خدا کرے دمِ آخر تک جاری رہے۔

حوادث و واقعات عبرت و موعظت کے لئے رکھے گئے ہیں۔ اس واقعہ سے جہاں موعظتِ حسنہ کی دولت ملتی ہے وہیں عبرت بھی ہم کنار ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس واقعہ سے نمایاں ہوتا ہے کہ ہر دو نامور بزرگ علماء آخرت میں سے تھے جنہوں نے اولاد کو قرآن کا پڑھنا پڑھانا عادتاً یا رسماً یا منافع دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت کے لئے طے کیا تھا۔ ان کا مقصد اس قرآن سے اولاد کا متمول یا صاحب ثروت و جاہ بنانا نہ تھا بلکہ خود کو اولاد کو آخرت کے لئے تیار کرنا تھا، جو قرآن کے نازل ہونے کا حقیقی مقصد ہے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ ان حضرات کو قرآن کے ساتھ کس درجہ شغف اور تعلق

تھا۔ کہ زندگی اور موت دونوں میں ان کے تلبّب اسی طرح رجوع کئے ہوئے تھے اور ہمہ وقت اسی قرآن کی حقیقی برکات سے منتفع ہونے کی فکر میں مستغرق تھے اور اپنی دنیا و آخرت بہر حال قرآن سے وابستہ کر چکے تھے۔

اندازہ کیا جائے کہ جن بزرگوں کو قرآن کے الفاظ اور اسکی تلاوت و قرأت سے یہ غیر معمولی ربط و تعلق تھا کہ اس کے الفاظ و کلمات کی تلاوت و قرأت اور اس کے اجر و ثواب سے دنیا و آخرت کے کسی کونے میں الگ رہنا نہیں چاہتے تھے تو اس کے معانی و علوم حقائق و صفات اور کیفیات و احوال سے کیسے وہ یکسو رہ سکتے تھے۔ ❊❊❊

درس قرآن

زمانہ ۱۹۶۵-۷-۱۶

افادات حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ صاحب امرتسری
بانی جامعہ اشرفیہ لاہور

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل

مرتبہ
احمد سعید ایم۔ اے۔ او کالج لاہور

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ ۔ آدمی کو اللہ فراغ نصیب فرمائے تو آدمیت یہ ہے کہ اللہ کی یاد میں لگ جائے یہ سمجھے کہ دنیا میں اللہ کی یاد کے لئے آیا ہوں۔ امام احمد کا قول ہے کہ مکان خالی ہو اور ــــــ خالی ہو تو بڑی دولت ہے۔ بنی اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ کتاب مل جائے تو ہم اسکی اتباع کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی حکم ہوا کہ تیس دن ٹھہر طور پر جب موسیٰ ٹھہرے تو ہم نے کتاب دیدی۔ دس دن اور بڑھائے تو ۴۰ دن ہوئے تو کتاب ملی۔

ــــ کا ارشاد کہ ۳۰ دن روزہ رکھا اور اعتکاف کیا۔ روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ کو بہت پسند ہے۔ امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ روزہ دار شام کو مسواک نہ کرے خوشبو چلی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ مسواک کرے کہ ایک نماز سے ۷۰ نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اختلاف امام صاحب اور امام شافعی کا ــ کہ مسواک سے خوشبو نہیں جاتی وہ معدہ سے رہتی ہے مسواک سے نہیں جاتی۔ ۴۰ کے عدد میں خاص حکمت ہے اس لئے صوفیاء چلہ ۴۰ دن کا کراتے ہیں۔ آجکل کا تصوف اور ہے اور بزرگوں کا اور رنگ ہے تو ۴۰ کے عدد میں برکت ہے۔

۴۰ دن عبادت میں مشغول رہے اور معصیت سے بچتا رہے تو قلب میں خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ۴۰ دن میں نطفہ خون سے گوشت اور گوشت سے انسان۔ تو

خلقت میں ۴۰ دن کو دخل ہے۔ رمضان شریف کے روزے ۳۰ دن اور راتوں کی بیداری قریباً ۱۰ دن بن جاتی ہے تو یہ ۴۰ دن ہو جاتے ہیں۔ اتنے دن گناہ سے بچنے سے عادت بن جاتی ہے گناہ سے بچنے کی۔ جاتے وقت موسیٰ نے ہارون سے فرمایا کہ قوم کی نگرانی کرتے رہنا اور اصلاح کرتے رہنا اور معذبین کی تابعداری نہ کرنا۔ موسیٰ کے بھائی کو نائب مقرر کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ شیخ اگر مریدین کی اصلاح نہ کر سکے تو خلیفہ مقرر کر دے۔ حضرت والا کا ارشاد کہ حضرت عمرؓ نے مشورہ کیا کہ میں سپرد کروں کام کو تو صحابہؓ نے فرمایا کہ سپرد کر کے اسکی نگرانی بھی ضروری ہے۔

تو عمرؓ نے درخواست کی کہ یا اللہ آپ ہی مدد فرمائیں۔ تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ انکے دین کی اصلاح کرتے رہنا۔ سمجھ لینا چاہیئے کہ انبیاء کو امت سے کتنی محبت تھی کہ بھائی کو وصیت کی کہ میرے بعد قوم کی اصلاح کرتے رہنا اور معذبین کی تابعداری نہ کرنا۔

موسیٰ طور پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ کلام میں لطف اسکو ہوتا ہے جس کو محبت ہو۔ حکایت ہے کہ ایک نمازی کو ایک عورت کے انتظار میں شام سے صبح تک ہمکلام رہ کر اذان کے وقت شکایت کی کہ تم نے عشاء کی اذان میں جلدی کیوں کی۔

آگئے درخواست کہ قال رب ارنی انظر الیك قال لن ترانی۔ کلام میں لطف کے بعد یہ درخواست کی مثنوی میں ہے کہ خود اپنے سے خطاب کہ اللہ کے متعلق صاف صاف بیان کر۔ جب خود ہی جواب دیدیا کہ تو برداشت نہیں کر سکے گا تو کیا بلا سے میں ختم ہو جاؤں گا۔ مگر وصال ہو جاتے تو موسیٰ نے کلام کے لطف سے درخواست دیکھنے کی کی۔

اور انا عرضنا الامانة میں جو انسان نے جرأت کی اسکی وجہ بھی کلام میں لطف ہی تھا کہ تمام مخلوق کے انکار کے باوجود انسان کہہ رہا ہے کہ میں برداشت کروں گا چاہے اس کے جد کچھ ہی ہو۔ اس کا منشاء عشق تھا کہ کلام کے لطف سے متاثر ہو کہ یہ جرأت کی تو کلام کی قدر ان کو ہوتی ہے۔ جنکو عشق کی چاشنی ہو۔ ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی۔ کہ اے موسیٰ تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔

مسئلہ نمبرا انظرنی کہ اگر ناممکن ہوتا تو درخواست نہ کرتے تو درجہ ذات میں دیکھنا ممکن ہے کہ موسیٰ درخواست کر رہے ہیں معتزلہ ناممکن کہتے ہیں۔ دوسرے لن ترانی کہ دنیا میں رویت شرعاً نہیں ہو سکتی۔ عقلاً ممکن ہے اور شرعاً ایسا نہیں ہو سکتا، حضورؐ کو دیدار مقام

آخرت میں ہوا گو زمانہ آخرت کا نہیں تھا۔ اہل سنت اور معتزلہ کا اختلاف تو جواب الٰہی میں ہے۔ لن ترانی [illegible] اری۔ یعنی آپ دیکھ نہیں سکتے میں تو دیکھا جا سکتا ہوں۔ جیسے آفتاب چمگادڑ سے کہے کہ تو نہیں دیکھ سکتا۔ خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوتی ہے، بیداری میں نہیں ہو سکتی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ پہاڑ طور کو دیکھئے اگر وہ ٹھہر سکا تو تم دیکھ سکو گے اگر نہ ٹھہر سکا تو نہیں دیکھ سکو گے۔ تجلی کا مطلب ہے نور۔ ترمذی میں ہے کہ حضور نے اپنے ____ رکھ کر فرمایا کہ اتنا نور اللہ نے طور پہ ڈالا تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ حضرت موسیٰ پہاڑ کی کیفیت کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

اس سے پہلے موسیٰؑ نے درخواست کی تھی دیدار کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیدار آپکی مصلحت کے خلاف ہے۔ میں اور نعمت آپ کو عطا کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا: اے موسیٰ ہم نے اس وقت کے تمام لوگوں میں آپ کو چن لیا ہے۔ دوسری نعمت کہ آپ کو رسول بنایا اور نعمت کہ میں بلا واسطہ فرشتوں کے آپ سے کلام کروں گا۔ آگے یہ فرمایا کہ ہم نے جو کچھ آپ کو دیا ہے، نعمتوں سے، ان کو یاد کیجئے اور شکر کیجئے۔ لیکن موسیٰ کو نبوت کے علاوہ سلطنت بھی تھی۔ ہارونؑ کو اسکی خلافت دے رہے تھے۔ مگر اللہ نے نعمتوں میں نبوت اور کلام کو گنا، سلطنت کو نہیں۔ تو پتہ دیا کہ اللہ کے ہاں دین کی قدر ہے دنیا کی نہیں۔ سبحان اللہ والحمدللہ کے پڑھنے سے روئے زمین کے خزانوں کو مل جانے سے زیادہ ثواب ہے۔ سلطنت بھی نعمت تھی مگر دینی نعمتوں کے مقابلے میں اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ حضور اکرم صلی اللہ نے جتنی دعائیں سکھلائی ہیں۔ اس میں ہر کہیں فرمایا کہ دنیا اور ما فیہا سے یہ کلمہ اور جملہ بہتر ہے۔ پیغمبر نے ہر قدم پہ اللہ کی یاد سکھائی ہے۔ تو دنیا بھی نعمت ہے۔ مگر رسالت اور ہم کلامی کی نعمت کا شمار فرمایا اور شکر کا مطالبہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ زبان اعضاء قلب سے اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے رہنا۔

وکتبنا لہ فی الالواح موعظۃ کہ ہم نے کتاب کے متعلق تختیاں لکھ دیں۔ بعض مفسرین نے کہا جبرئیل علیہ السلام نے لکھیں بعض نے کہا کہ اللہ نے لکھیں۔ تین چیزیں اللہ نے ہاتھ سے بنائیں۔ آدم جنت اور یہ تختیاں۔ آگے ہے فخذھا بقوۃ اس کا مطلب ہے کہ خود مضبوطی سے عمل کیجئے جب پیغمبر کو بھی حکم ہے کہ قوت سے عمل کیجئے تو سمجھ لیجئے کہ کوئی مقام ایسا

نہیں کہ آدمی احکام شریعت کا مکلف نہ رہے۔ دوسرے عمل میں دوام ہو۔ عمل میں قوۃ سے مراد مفسرین یہ بھی لکھ رہے ہیں۔ قوۃ کا مطلب اخلاص بھی لیا ہے۔ یعنی صرف اللہ کو خوش کرنا ہی مقصود ہو۔ حدیث میں علماء غنی اور مجاہدین کی پیشی کا قصہ اور ان کو اوندھا جہنم میں ڈالنے کا قصہ ہے۔ تو اخلاص نہ ہونے یا ہونے کی وجہ سے نفع کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ قوۃ احسان بھی داخل ہے۔

ما الاحسان یا رسول اللہ - کی حدیث کے راوی حضرت عمرؓ ہیں۔ احسان کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی بن دیکھے ایسی عبادت کرے کہ جیسے دیکھ کر کرتا۔ خشوع بھی قوۃ میں داخل ہے تو فرمایا: خذھا بقوۃ وامر قومك - پہلے ہے پھر عمل ہے اور عمل کے ساتھ قید میں ہیں اور یہ ساری چیزیں آسانی کے ساتھ ادا ہونے کے لئے محبت اور خوف کی ضرورت ہے یأخذوا باحسنھا ساوریکم دار الفسقین - کہ بہت جلد ہی فاسقین کی جگہ سلطنت دینگے بعض کا قول ہے کہ ملک شام کی سلطنت دیں گے بعض کا قول ہے مصر۔ بہرحال جو بھی ہو ——— اصل میں ذریعہ ہے اعمال صالحہ کا۔ آجکل کے لوگ جو اعمال میں حکمتیں ڈھونڈتے ہیں یہ سب غلط ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ عبادات حصول دنیا کا ذریعہ ہیں۔ ایک صرف رضائے حق کے لئے ہے۔ ایک یہ کہ مقصود تو رضائے حق ہے اس کے ساتھ دنیا کا نفع بھی آجاتا ہے۔ اس نیت سے دین کا کام نہ کرے کہ دنیا مل جائے گی۔ جیسے مقصود بیت اللہ تو راستے میں جدہ اور کراچی بھی آجائیں گے۔ اصل مقصود تو دین ہے۔ دنیا بطریق لزوم کے آجائے گی۔

موسیٰ علیہ السلام کا پہاڑ طور پر تشریف لے جانے کے بعد قوم میں فتنہ برپا ہوا۔ آگے اسکا ذکر ہے۔ واتخذ قوم موسیٰ من بعدہ الخ ——— قصہ یہ ہوا کہ ایک بچھڑا بنایا گیا جس کا جسم بھی تھا۔ اور اس میں سے آواز بھی آتی تھی۔ تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے فرعونیوں سے شادی کے بہانے زیور مانگے تھے۔ الی آخر قصہ۔ سامری نے ان زیوروں سے وہ بچھڑا بنایا اور جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کی مٹی اس میں داخل کی، اس مٹی کا اثر تھا کہ وہ زندہ ہوگیا۔ بنایا تو ایک نے تھا مگر قوم کی رضا کی وجہ سے واتخذ قوم موسیٰ فرمایا۔ یعنی ساری قوم کیطرف نسبت فرمائی۔ روح المعانی نے لکھا ہے کہ سامری کا نام بھی موسیٰ ہی تھا اور اسکی پرورش حضرت جبریل علیہ السلام نے کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون

سے کی جنکو اللہ نے رسول بنایا اور سامری کا ذکر ہے۔

وموسیٰ الذی ربّاہ فرعون مرسل وموسیٰ الذی ربّاہ جبریل کافر

دوسری جگہ قصہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا تو اس نے کہا کہ حضرت جبریل کے گھوڑے کے قدموں کی مٹی ڈالی تو اس بچھڑے کی یہ کیفیت ہوئی۔ علماء کا اتفاق ہے حیات میں مگر جسم کے متعلق اختلاف ہے کہ گوشت پوست ہوگیا تھا یا چاندی سونے ہی کا تھا۔ معتزلہ کا جواب کہ سرسراہٹ تھی بچھڑے کے خلاء میں، حالانکہ خوار بچھڑے کی آواز کو کہتے ہیں۔ دوسرے بنی اسرائیل نے کوئی بڑی تبدیلی دیکھی تھی کہ اسکی پوجا شروع کردی۔ تیسرے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کی ٹاپ کی مٹی کا اثر تھا۔ اور جبرئیل کا نام اللہ نے روح رکھا ہے یعنی زندگی تو موثر حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ صحبت سے اثر ہو جاتا ہے، جیسے مٹی میں اثر آ گیا۔

درپے خوباش با خوش خونشین خو پذیری گل از روغن بہ بین

واتخذ قوم موسیٰ من بعدہ من حلیھم۔ اپنے زیوروں سے علماء کی تحقیق کہ ان کی ملک تھے یا نہیں قرآن نے نسبت بنی اسرائیل کی طرف کی دلیل یہ کہ فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد ان کا ملک آ گیا تھا۔ بعض کا قول کہ تسلط تو عاریت سے تھا نسبت صرف ان کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے قرآن شریف نے فرما دی۔ فقہاء کو یہاں موقعہ ملا ہونے کا تو اس تحقیق میں لگے۔ شریعت کے علم کی ضرورت ہے اس کا بہت قحط ہے ویسے علم کہ ترجمہ جانتا ہو ایسے علماء بہت ہیں۔ تو فقہاء نے تحقیق کی ایک جماعت نے کہا کہ فرعون نے ظلم سے ان کی مزدوری نہ ادا ہوئی تھی یہ من حلیھم عجلاً جسداً جسم اور جسد میں فرق۔ جسد عام ہے اور جسم خاص۔ بنی اسرائیل بچھڑے کے بولنے کے وقت سجدہ کرتے تھے۔ اور خاموش ہوتا تو سجدے سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ یہ خرقِ عادت شکل میں کرامت کے تھی۔ لیکن خرقِ عادت بھی ہو تو شریعت کے تحت ہی رہے گا۔

در راہ عشق وسوسہ اہرمن بسے است

ہوش دار گوش را بہ پیامے سروش داد

یروا انہ لا یکلمھم ولا یھدیھم سبیلاً۔ کہ یہ بچھڑا نہ کلام کرسکتا نہ رستہ بتلاسکتا تھا۔ یہ تو انسان سے بھی کم تھا۔ صرف ٹیں ٹیں بچھڑے کیطرح کرنے سے

معبود بنالیا۔

اتخذوہ وکانوا ظالمین۔ ظلم کا معنی شے کو بے محل کا نے رکھنے کے یعنی یہ کام بے موقعہ کر رہے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے تنبیہہ کرنے کے بعد یہ لوگ افسوس کرنے لگے۔ سقط فی ایدیھم۔ کا معنی یہ ہے کہ اپنے ہاتھ ندامت سے کاٹنے لگے۔ بعض کا قول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے ہی کچھ ندامت ہو چکی تھی اور ندامت اللہ کا بڑا افضل ہے جب کہ گناہوں کے بعد ندامت ہو جائے گا۔ حضور کی دعا ہے: اے اللہ ہمیں نفسوں کے سپرد نہ کر۔

گر ہزاراں دام باشد ہر قدم چوں تو با ما آئی ندارم ہیچ غم

لاکھ ٹوٹی کشتی ہے منجدھار سے

ناخدا تو ہے تو بیڑا پار ہے

ہمت سے چلنے سے حق کی معیّت ہوتی ہے۔ گناہ کے تقاضا کے وقت آدمی سمجھ لے کہ جہاد کا موقعہ آرہا ہے۔ اور یہ سمجھ لے کہ نفس اور خواہشات نفس تو نفع کے لئے ہے کہ اس کے مقابلہ میں مشقت ہو گی اور مشقت سے درجات بڑھتے ہیں۔ اگر نفس اور خواہشات نہ ہوتے تو یہ مجاہدہ کی دولت نہ ملتی۔

ولما رجع موسیٰ الی قومہ غضبان آسفا قال بئسما خلفتمونی من بعدی دین کی بات کے خلاف کرنے پر غصہ آنا غیرت کی بات ہے۔ مشکوٰۃ میں بستی الٹنے میں ایک دین دار کی شکایت ہے کہ خلاف دین پر غصہ نہیں آتا تھا۔

اسی حالت میں موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارونؑ کا سر پکڑ کر کھینچا۔ اور ہارونؑ نے فرمایا اے میرے ماں جائے بھائی دشمنوں کے سامنے مجھے رسوا نہ کیجیو۔ اور اس فعل پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ملامت نہ فرمائی اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام پر بغض للہ کا حال غالب تھا اور حدیث میں قلب کی موت کی یہ دلیل ہے کہ گناہ دیکھ کر غصہ نہ آئے۔ آگے موسیٰ علیہ السلام کی رب اغفرلی ولاخی کی درخواست کرنا آدمی اس سے سبق حاصل کرے کہ غلطی کی شکل پر بھی مغفرت مانگ رہے ہیں۔

پہلے بچھڑے کی پوجا کی غلطی کا ذکر تھا۔ آگے فرمایا: ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم۔ کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کو اللہ کا غضب

پہنچنے والا ہے۔ ان کے رب کیطرف سے۔ غضبٌ کی تنوین میں غضب کی شدت
بیان کی اور دوسرے رَبِّهِمْ سے شدّت غضب کو بیان کیا کہ ان کے پیدا کرنے والا
روزی دینے والا باقی رکھنے والا ناراض ہو گیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اتخاذ العجل سے انہوں
نے اللہ کا حق بے جان چیز کو دے کر جرم بھی بہت بڑا کیا۔ اسی لئے قرآن نے فرمایا کہ
شرک پر موت آنے سے نجات کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ قبروں پر طواف
چڑھاوے نذر وغیرہ یہ عبادت ہے جو صرف اللہ ہی کو چاہئے۔ اسی طرح کسی بزرگ
کے نام کا وظیفہ مثلاً یا گنج شکر یا گنج شکر بھی ناجائز ہے تو اللہ نے غضب اس لئے
فرمایا کہ جرم بڑا تھا۔ مسلمان کو تو شبہ ناراضی کا بھی برداشت نہیں ہو سکتا۔ مشکوٰۃ شریف
میں کتاب الرقاق میں ایک صحابی کو مکان کا قصہ احتمالی عقلی نہ سنا ہو، وظیفہ میں ہوں
میں نے نہ سنا سلام کا جواب یا اور وجہ سے ناراض یا اب معافی مانگ لے۔ (یہ
پانچ وجوہات احتمال عقلی ہو سکتے تھے۔) قرآن مجید میں تین صحابہؓ کا ذکر ہے جو غزوۂ تبوک
میں شرکت سے رہ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ضاقت علیہم الارض بما رحبت
یہ ان کے قلب کی حالت ذکر فرمائی۔ یہ شبہ تھا ناراضی کا۔ جہنم اللہ کے غضب کا مظہر ہے۔
اور جنّت رضامندی کی مظہر ہے۔ اگر یقین ہو جائے کہ اللہ راضی ہیں پھر جہنم میں بھی ان کو
راحت اور خوشی ہی رہے گی، جیسے خزنۃ جہنم ملائکہ جہنم ہی میں خوش ہیں، جان کے
بدلے میں بھی رضا الٰہی بہت سستی ہے۔ تو اتخاذ العجل پر غضب ان کے رب کیطرف سے
بہت بڑی سزا ہے۔

دوسری سزا ذلت فی الحیوۃ الدنیا۔ کہ حیات دنیا میں ذلیل کیا۔ یہ بھی بہت بڑی
سزا ہے۔ مغویہ عورتیں جو ہندوستان میں رہ گئیں، اکثر عورتوں نے خودکشی کر لی تاکہ ذلت
سے بچیں۔ ذلت ایسی سزا ہے کہ اس سے سخت کوئی سزا نہیں۔ یہ دونوں سزائیں غیر اللہ
کی پوجا کی وجہ سے دیں۔ آدمی کو چاہئے کہ اپنے کو ہر قسم کے شرک سے بچائے۔ عیسائی
اور یہودی پیغمبروں کو اللہ کا بیٹا بناتے ہیں۔ مسلمان کا گو عقیدہ شرک تو نہیں مگر شکل شرک
کی ہے۔ اسی لئے شریعت نے شکل شرک کو بھی حرام کر دیا۔ جیسے طلوع عین زوال اور
عین غروب کے وقت یا قبر کو سامنے رکھ کر نماز اور سجدہ حرام کر دیا، تاکہ سورج پرستوں
کے یا بت پرستوں کے ہم شکل نہ بنیں۔

پناہ بلندی و پستی توئی   ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

صوفی کو جب عظمتِ حق کا مشاہدہ ہوتا ہے تو سارے جہان کو عدم کہہ دیتا ہے ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید
خجل شد چوں پہنائے دریا بہ دید

یعنی سمندر کو دیکھنے سے پہلے کے خیال کو چھوڑ دیا۔ صوفی کو مشاہدہ حق کے وقت تمام عالم بوند سے بھی کم اور فانی محسوس ہوتا ہے۔ تو ایسی حالت میں وہ کیا کسی کی پوجا کرے گا۔

مؤحد چہ بر پائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراس نباشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید و بس

یہ وارد ہوتا ہے عظمتِ حق کی وجہ سے اور اس میں ہوش بھی باقی رہے، یہ تب ہوتا ہے کہ کامل صوفی بنے۔ لوگ اسی کو شرک کا ذریعہ بناتے ہیں۔ غضب اور ذلت کی برائی کا موت کے وقت پتہ چلے گا۔ اور یہیں یہ سنا کر غلطی سے بچانا مقصود ہے کہ تم ایسے نہ ہونا۔ موسیٰ علیہ السلام کو پتہ دیا کہ ان پر غضب اور ذلت ہوگی۔ آج تک وہ ذلیل ہیں گو آج ان کے پاس سلطنت ہے، لیکن لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہی ہیں۔ کہ رب کیطرف سے غضب اور ذلت میں ہیں۔

وکذالک نجزی المفترین۔ ہر ایسے شخص کو ایسی ہی سزا دیں گے کہ یہ افترا باندھنے والے ہیں اللہ پر۔ آگے والذین عملوا السیئات ثم تابوا من بعدھا و آمنوا ان ربک من بعدھا لغفور رحیما۔ کہ ہم ایسے ہیں کہ اتنے بڑے جرم کے بعد بھی توبہ کرنے پر معاف کر دیتے ہیں۔ مگر شرط توبہ میں ایمان کو بھی ذکر فرمایا۔ کافر کی توبہ صرف شراب وغیرہ سے کافی نہیں بلکہ ایمان بھی شرط ہے۔ مسلمانوں کے لئے گناہوں سے صرف توبہ کافی ہے۔ اوپر فعل اور اسکی سزا ذکر ہوئی۔ آگے اس سزا سے بچنے کا طریق تبلایا تابوا کا لغوی ترجمہ ہے پہلی حالت سے لوٹ آنا۔ شریعت کی اصطلاح میں اللہ کی نافرمانی کے ضرر کو پہچان لے توبہ سے گناہ کے ضرر کا علم آتا ہے۔ جیسے زہر کھانے کا علم۔ کثرت سے لوگ اس علم سے خالی ہیں۔ اس کے بعد قلب میں بے چینی ہوتی ہے جیسے زہر کھانے کے بعد پتہ چلے کہ یہ زہر ہے تو بے چینی ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر عمل وہ یہ کہ اس چیز کو چھوڑ دیا۔ ارشادِ نبوی ہے التوبۃ الندامۃ جسکو اوپر بے چینی میں نے کہا۔ اس میں علم، بے چینی، اور عمل تینوں چیزیں حضورؐ نے

باقی صفحہ ۵۹ پر

مرتبہ محمد اقبال قریشی۔ ہارون آبادی

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

کے

علوم و معارف

بروایت

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

احوال و سوانح

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

کسی موضوع پر لکھنے کے لئے اتنی ہچکچاہٹ، تذبذب اور سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہوئی، جتنی حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے حالات لکھنے میں ہوتی ہے۔ قلم لرزہ براندام ہے اور آپ کے کمالات لاتناہی۔ اس روسیاہ میں اتنی ہمت کہاں کہ آپ کے متعلق کچھ لکھے۔

ہمہ عالم ہے تحیر کا زباں ہے نہ قلم ہے

لیکن بھائی برادر محترم، محب مکرم مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کے حکم سے حضرت نانوتویؒ کے ملفوظات طیبات لکھتا ہوں۔ تمہید میں چند سرخیوں کے تحت آپ کے کمالات کیطرف بھی اشارہ کرتا ہوں۔ شاید اسے نظر استحسان سے دیکھا جائے — وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ اس قدر جامع کمالات ہستی تھے کہ کوئی تمام عنوان بھی آپ کے اوصاف و کمالات کے نہیں لکھ سکتا۔ ع۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ولادت | حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ کو پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام اسد علی تھا جو نہایت ہی صاحب مروت و اخلاق مہمان نواز، کنبہ پرور اور نمازی پرہیزگار تھے۔ مولانا نانوتویؒ کا تاریخی نام خورشید حسین ہے۔

تعلیم و تربیت | حضرت مولانا نانوتویؒ اپنے گھر میں اکلوتے بیٹے تھے اس لئے آپ کی پرورش بہت لاڈ پیار سے ہوئی۔ مگر اس کا آپ پر کوئی برا اثر نہ ہوا بلکہ بچپن ہی

سے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کا اعلیٰ نمونہ تھے ۔ قرآنِ پاک آپ نے نانوتہ کے مکتب میں پڑھا۔ اس کے بعد دیوبند میں مولانا مہتاب علی صاحبؒ کے مکتب میں عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ یہاں سے سہارنپور اپنے نانا جان کے یہاں تشریف لے گئے اور مولانا محمد نواز صاحب سے پڑھا۔ نانا جان کے انتقال پر نانوتہ تشریف لے گئے ۔ ذوالحجہ ۱۲۵۹ھ میں حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ آپ کو دہلی ساتھ لے گئے۔ آپ نے ان سے کافیہ پڑھنا شروع کیا۔ حسنِ اتفاق سے ۱۲۶۱ھ میں دو سال بعد قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی بھی آپ کے ہم سبق ہوئے ۔ علوم عربیہ کی اکثر کتابیں دونوں نے حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ سے پڑھیں۔ البتہ حدیث پاک حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے حرفاً حرفاً پڑھی۔

کتابت | فراغت طالب علمی کے بعد ۱۲۶۷ھ میں مطبع احمدی میں کتابت کا کام شروع کیا ۔ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ کی بخاری شریف کی تصحیح فرمائی۔ ۵ یا ۶ پارے خود لکھے ۔ میرٹھ اور دہلی کے پریس میں عرصہ دراز تک کتابت کا کام کیا۔

درس و تدریس | درس و تدریس کا سلسلہ طالب علمی کے دوران ہی شروع کر دیا تھا چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو اپنے استاد حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کے حکم سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھاتے اور مشق کراتے ۔ زمانہ کتابت میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ اس زمانے میں آپ نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ اور مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مراد آبادی کو حدیث پڑھائی۔ آخر عمر میں مسجد چھتہ دیوبند میں پڑھانا شروع کیا اور انتقال تک پڑھاتے رہے ۔

تصانیف | آپ کی مشہور تصانیف آبِ حیات ، تحذیر الناس ، قبلہ نما ، تحفۂ لحمیہ ، مباحثۂ شاہجہانپور، توثیق الکلام ، اجوبۂ اربعین ، تقریر دلپذیر ، جمال قاسمی ، انتصار الاسلام ،

---

[۱] اور ایسے ہمدم بنے کہ تا زیست جدا نہ ہوئے ۔ حسنِ اتفاق سے جہاں دونوں نے ایک ہی استاد حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ سے تعلیم حاصل کی ۔ اسی طرح تربیت باطنی بھی ایک ہی پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے حاصل کی ۔

گل و بلبل کیطرح ان سے ہے نسبت ان کو لوگ لیتے ہیں ان کا نام انکے نام کیساتھ

تصفیۃ العقائد اور حجۃ الاسلام ہیں۔ یہ کتابیں اردو میں ہیں۔ الفاظ اور عبارت بھی سہل ہے مگر ان کا سمجھنا عوام تو کجا اکثر علماء کیلئے بھی دشوار ہے۔ کیونکہ علوم بہت مشکل ہیں۔

بیعت | بچپن ہی سے حضرت حاجی صاحبؒ سے قلبی تعلق تھا۔ حضرت گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ حدیث شریف پڑھنے کے دوران اکثر خیال ہوتا کہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے بیعت ہو جائیں۔ مگر ہر بار حضرت نانوتویؒ فرماتے نہیں بیعت تو حضرت امدادؒ ہی[1] سے کریں گے۔ چنانچہ آپ حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور سلوک کی تکمیل کی۔

مہارت فنون حربیہ | فنونِ حربیہ میں مہارت کے سبب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ کو تھانہ بھون اور شاملی کا سپہ سالار بنایا گیا اور یہاں آپ نے اپنے جوہر دکھائے۔

اتباع سنت | ۱۸۵۷ء میں جب گورنمنٹ کیطرف سے گرفتاریاں شروع ہوئیں تو آپ صرف تین دن روپوش رہے۔ اس کے بعد لوگوں کے اصرار پر انکار فرمادیا کہ تین دن سے زیادہ روپوشی خلافِ سنت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غارِ ثور میں صرف تین دن ہی مقیم رہے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ دوش کے سپاہیوں سے ملاقات ہوگئی تو انہوں نے آپ ہی سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کہاں ہیں۔ آپ نے دو قدم پیچھے ہٹ کر فرمایا ابھی تو یہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے دین کا بڑا کام لینا تھا اس لئے ہاتھ نہ آئے۔

مناظرے | انگریزوں کا مقصد ہندوستان میں الحاد، بے دینی، نفاق و افتراق پھیلانا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانا تھا۔ چنانچہ پادریوں نے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی۔ غیر مسلم اس سے بہت متاثر ہوئے۔ مسلم رہنما آڑے آئے اور پادریوں سے مناظرے کئے۔ چنانچہ میلہ خداشناسی یا مباحثہ شاہجہان پور میں یہودیوں اور نصاریٰ کو شکست فاش دی۔ اسلام کی حقانیت اور برتری کی سب پر دھاک بٹھادی۔ پنڈت دیانند نے بھی اسلام سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ ۱۲۹۵ھ میں رڑکی میں مناظرہ ٹھہرا۔ عین وقت پر پنڈت فرار ہوگیا۔ چنانچہ آپ

---

[1] حضرت حکیم الامتؒ نے بھی شریف الدرایات حواشی امیر الروایات میں تحریر فرمایا ہے کہ مدار اس کشش کا مناسبت ہے۔ تفاضل میں اسکو دخل نہیں۔ حدیث اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بد خو نکند بکسے نگاہے (ارواح ثلاثہ ص ۲۳۳)

نے اس کے اعتراضات کا جواب اپنے رسالہ قبلہ نما میں عجیب و غریب دلائل سے دیا ہے۔

حج | پہلا حج آپ نے ۱۲۷۷ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی معیت میں اور دوسرا حج ۱۲۹۴ھ میں حضرت گنگوہیؒ اور دوسرے اکابرین ملت کیساتھ کیا۔

وصال | دوسرے حج کے بعد ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ میں وطن واپس ہو رہے تھے کہ جدہ میں آپ کو سخت بخار آگیا۔ جہاز میں اتفاقاً وبائی مرض پھیل گیا۔ ایک دو آدمی روزانہ مرتے تھے۔ بمبئی پہنچ کر اس قدر کمزور ہو گئے کہ بیٹھنا مشکل تھا۔ نانوتہ پہنچ کر بخار تو جاتا رہا، لیکن کھانسی ٹھہر گئی۔ اسی دوران مناظرہ رڑکی پیش آیا۔ واپسی پر مرض ابھر آیا اور بڑھتا رہا۔ چند مرتبہ دورہ پڑا۔ حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی اور ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب مظفر نگری آپ کے معالج تھے۔ اسی دوران حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے انتقال پر سہارن پور تشریف لے گئے مگر شام کو واپس آگئے۔ درمیان میں عارضی افاقہ ہوا آپ نے پڑھانا شروع کیا۔ مرض کا پھر حملہ ہوا۔ آخر کار ۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ بروز جمعرات بعد از نماز ظہر آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے جنازے میں بہت سے رجال الغیب شریک ہوئے جو جنازہ کے بعد دن میں نظر نہیں آئے۔ بہت سی تاریخیں لکھی گئیں۔ اختصار کے پیش نظر تین بزرگوں کی درج کرتا ہوں۔

۱۔ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحبؒ	ع	وفات سرور عالمؐ کا یہ نمونہ ہے۔
۲۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ		گیا چراغ گل ہوا۔ مصیبت پر آئی مصیبت
۳۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ		پیوند خاک زہد و سخا ہوں ہزار حیف

۱۲۹۷ھ

محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم | سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کو تھی اس کا اندازہ آپ کے ان چند اشعار سے لگائیے۔ سبحان اللہ ہر شعر سے محبت ٹپکتی ہے ؎

اڑا کے باد مری مشت خاک کو پس مرگ
کرے حضورؐ کے روضہ کے آس پاس نثار

جب حضرت نانوتویؒ مباحثہ شاہجہانپور سے مظفر و منصور واپس آئے تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا مجھے آپ کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو جو ان سے کام لینا تھا پورا ہو گیا وہ یہ کہ تمام مذاہب کے جھتے میں اسلام کی منادی ہو جائے اور خدا کی محبت اس کے بندوں پہ پوری ہو جائے۔ چنانچہ اس مناظرہ کے تھوڑا عرصہ بعد انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (ارواح ثلاثہ ص۲۷۰)

دے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاک قاسمؒ کا
کہ جائے کوچہ اطہر میں تیرے بن کے غبار
امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار
جو یہ نصیب نہ ہو پھر کہاں نصیب مرے
کہ ہوں سگانِ حرم کی میں تیرے قطار

سخاوت | جس وقت آپ قطب عالم حضرت گنگوہیؒ کے ہمراہ حج کو جا رہے تھے ایک گروہ حضرت گنگوہیؒ کے پاس آیا کہ ہم بھی ہمراہ چلیں گے۔ آپ نے پوچھا زادِ راہ بھی ہے۔ انہوں نے کہا نہیں ایسے ہی توکل پر چلیں گے۔ مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا جب ہم مینجر سے جہاز کا ٹکٹ لیں گے تم توکل کی پوٹلی سامنے رکھ دینا۔ بڑے آئے توکل کرنے والے، جاؤ اپنا کام کرو۔ حضرت نانوتویؒ سے اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دے دی۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

راستہ میں جو کچھ ملتا سب ان لوگوں کو دے دیتے۔ ساتھیوں نے عرض کیا، آپ تو سب ہی دے دیتے ہیں۔ کچھ تو اپنے پاس رکھتے۔ فرمایا: اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ۔ (ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۲۲۹)

کرامت | حج کے دوران کوئی حافظ نہ تھا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ آپ روزانہ ایک پارہ حفظ کر کے شام کو تراویح میں سنا دیتے اور آہستہ آہستہ یاد فرماتے تھے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ قرآنِ پاک حفظ کر لیا۔ یہ آپکی کرامت ہے۔ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۱۶)

ادب اور احترام | استفاضہ علم میں ادب اور تقویٰ کو بڑا دخل ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے پوچھا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے وہی کتابیں پڑھی تھیں جنکو سب پڑھتے ہیں۔ پھر ان کو اتنا علم کہاں سے آیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ اس میں کئی چیزوں کو دخل ہے۔ ایک تو مولاناؒ طب کی رو سے معتدل مزاج تھے۔ اس سے ان پر نفس کامل فائض ہوا۔ دوسرے یہ کہ استاد بڑے کامل ملے یعنی مولانا مملوک علی صاحبؒ، جن کا علم و فضل مخفی نہیں تیسری یہ بات کہ متقی اعلیٰ درجہ کے

تھے - پھر ان میں استاد کا ادب بہت تھا۔ اور پھر پیر بھی بڑے کامل ملے - یعنی حضرت حاجی صاحبؒ ادب کی یہ کیفیت تھی کہ مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ - جب بیماری میں آپ کے پاس آتے تو آپ اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے - ایک مرتبہ مولوی صاحب موصوف نے دریافت کیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں - تو فرمایا کہ حضرت آپ میرے استاد ہیں - انہوں نے کہا کہ میں کہاں سے استاد ہو گیا - فرمایا کہ ایک مرتبہ مولانا مملوک علی صاحبؒ کسی کام میں تھے تو آپ سے فرمایا تھا کہ ذرا ان کو کافیہ کا سبق پڑھا دو - چنانچہ میں نے آپ سے سبق پڑھا تھا۔ دوسرا قصہ یہ ہے کہ تھانہ بھون کا ایک گندھی جسکو اہل علم سے محبت تھی مجھ سے (حضرت حکیم الامتؒ) کہتا تھا کہ ایک بار میں دیوبند میں مولاناؒ کی مجلس میں حاضر ہوا - مولاناؒ نے فارغ ہو کر پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو، اس نے کہا کہ تھانہ بھون سے آیا ہوں - یہ سن کر گھبرا گئے اور فرمایا کہ بے ادبی ہوئی وہ تو میرے پیر کا وطن ہے - آپ آئے اور میں بیٹھا رہا، مجھ کو معاف کیجئے - وہ گندھی کہتا تھا کہ میں مولاناؒ کی اس حالت کو دیکھ کر شرمندگی سے مرا جاتا تھا - ایک دفعہ حضرت حاجی صاحبؒ مولاناؒ کے ادب کا ذکر فرماتے تھے کہ میں نے اپنا ایک مسوّدہ مولاناؒ کو نقل کیلئے دیا - ایک مقام پر املاء میں غلطی ہو گئی تھی - مولاناؒ اس مسوّدہ کو نقل کر کے لائے تو اس لفظ کی جگہ بیاض میں چھوڑ دی، صحیح بھی نہیں لکھا کیونکہ یہ تو حضرت حاجی صاحب کے کلام کی اصلاح تھی اور غلط بھی نہیں لکھا - کیونکہ یہ علم کے خلاف تھا اور عمداً خطا تھی - اور آکر فرمایا کہ اس جگہ پڑھا نہیں گیا اور غرض یہ تھی کہ دیکھ کر غلطی درست کر دیں مگر کس عنوان سے کہا یہ نہیں کہ غلطی ہو گئی - چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے قلم سے کاٹ کر درست لکھ دیا - ان باتوں کے جمع ہونے سے یہ برکت آپ کو حاصل ہوئی (ملفوظات کمالات اشرفیہ ص۱۵۳

ارضاء الحق حصہ اوّل ص۲۷، کوثر العلوم ص۴)۔

پیر و مرشد سے محبت | واقعہ بیعت پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے اور پیر و مرشد سے محبت کا اندازہ لگائیے - حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ اس قدر ذہین تھے کہ دوران طالب علمی جب آپس میں بحث ہو جاتی تو لوگ سننے کیلئے جمع ہو جاتے - جب حضرت گنگوہیؒ دلائل دیتے تو لوگ سمجھتے کہ اب ان کا جواب نہ ہو سکے گا - لیکن جب حضرت نانوتویؒ رد فرماتے اور دلائل توڑتے تو لوگ دنگ رہ جاتے - حضرت گنگوہیؒ پھر جواب الجواب دیتے پھر حضرت نانوتویؒ - یہ مشغلہ عوام الناس کیلئے بڑا دلچسپ ہوتا - سب نہایت غور سے

بحث سنتے۔ سفر حج میں ایک مرتبہ مقتدا بننے کے بعد دونوں کی بحث ہوگئی اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا چلو ہم حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں جا تو رہے ہیں۔ ان سے فیصلہ کرالیں گے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا وہ تو فن تصوف کے کے امام ہیں وہ یہ مسئلہ کیسے حل فرما سکتے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا اگر وہ یہ مسئلہ حل نہ کر سکے تو ناحق ہم نے ان سے تعلق پیدا کیا۔ جب مکہ پہنچے تو پوچھنے سے قبل ہی حضرت حاجی صاحبؒ نے خود ہی اس کا صحیح فیصلہ فرما دیا۔ اس پر حضرت نانوتویؒ کو مسرت کی اور حضرت گنگوہیؒ کو تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ (الافاضات الیومیہ)

شفقت علی الخلق | حضرت نانوتویؒ کے پاس اگر کوئی بیٹھا ہوتا تو اشراق اور چاشت بھی قضا کر دیتے تھے (کمالات اشرفیہ صـ۲۲۶) تاکہ اسکی دلشکنی نہ ہو کیونکہ حضرت حاجی صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ صرف تسبیح پھیرنا ہی نہیں دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں بھی تطییب قلب مومن ہے۔

نمونہ کلام | حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ مع اپنے تمام شاگردوں کے دہلی کے مشاعروں میں جایا کرتے تھے تاکہ طلباء میں جولانی طبع پیدا ہو۔ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۵۱ء) اس دور کے مشہور شعرا غالب، ذوق اور مومن تھے۔ انہیں کی بحر میں کہے ہوئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رقیب مہر کے قابل عدو وفا کے لئے
بنے تھے ہم ہی فقط آپ کی جفا کے لئے
ہمیں تو صبر کو کہتے ہیں شیخ و واعظ سب
انہیں تو کوئی بھی کہتا نہیں وفا کے لئے
وہ بات کیا ہے کہ مر کر بھی قاتل بے رحم
قتیل تیرے تڑپتے رہے جفا کے لئے

باقی مستفیض، مستفید اور محظوظ ہونے کے لئے آپ کے مطبوعہ کلام کا مطالعہ کرنا مناسب ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا مقام پیر و مرشد کی نظر میں | حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے رسالہ ضیاء القلوب فارسی میں الہام سے جو کچھ آپ کے متعلق تحریر فرمایا۔ ملاحظہ فرمائیے:

ہم اس کا ترجمہ لکھتے ہیں :

" جو آدمی اس فقیر (حضرت حاجی صاحبؒ) سے محبت، عقیدت اور ارادت رکھتا ہے۔ اسے چاہیئے کہ مولوی محمد قاسم صاحبؒ اور مولوی رشید احمد صاحبؒ جو کہ تمام ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں۔ میری طرح بلکہ مجھ سے بڑھ کر شمار کرے۔ اگرچہ معاملہ برعکس ہے وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہوں۔ ان کی صحبت کو غنیمت سمجھے کیونکہ ان جیسے آدمی اس زمانہ میں نایاب ہیں "

نیز آپ فرمایا کرتے کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لائے تو میں قاسمؒ اور رشیدؒ کو پیش کروں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (حیات اشرف)

حضرت نانوتویؒ نے ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں ذکر کے وقت زبان کے جکڑنے اور قلب پر بوجھ ہونے کی شکایت کی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا یہ حالت ثقل وحی کا نمونہ ہے۔ انشاء اللہ علم نبوت سے آپ کو حصہ ملے گا۔ (اول الاعمال ص۲۹)

امیر شاہ خاں صاحب مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحبؒ کی مجلس میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اور ان کے مناقب بیان کیئے جا رہے تھے حضرتؒ نے مولانا نانوتویؒ کیطرف اشارہ کر کے فرمایا۔ مولانا اسماعیلؒ تو تھے ہی کوئی ہمارے اسمٰعیل کو بھی دیکھے۔ (ارواح ثلاثہ ص۲۷۷)

حضرت نانوتویؒ کا مقام اکابرینِ امت کی نظر میں

حضرت گنگوہیؒ نے آپ کے انتقال پر فرمایا تھا۔ اگر میرے پاس ایک چیز نہ ہوتی تو میں ہلاک ہو جاتا۔ (الافاضات الیومیہ جلد ۳ ص۲۲۶) نیز آپ کو مجتہد وقت کہا کرتے۔ (کمالات اشرفیہ ص۲۲۶)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ شجرہ چشتیہ عالیہ امدادیہ میں آپ سے سلسلہ بیعت رکھنے والوں کے توسل کیلئے فرماتے ہیں ؎

بحق رہنمائے اہل تحقیق　　امام اہل حق اولاد صدیق

ملاذ خاص و عام از نقص ایماں　　پناہ ہر اسیر نفس و شیطان

باں کو رشد محمد قاسمش نام　　فیوض غیب را بر جملہ قسام

(مناجات مقبول ص۲۲۴)

نیز آپ کے علم کے بارے میں فرمایا۔ آج صبح کی نماز میں سورہ مزمل پڑھ رہا تھا کہ

اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گزرا کہ میں تحمل نہ کر سکا قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے مگر وہ دریا جیسا ایک دم آیا ایک دم نکل گیا۔ نماز کے غور کرنے پر منکشف ہوا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ان ساعتوں میں میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے تھے۔ یہ ان کی توجہ کا اثر تھا۔ پھر فرمایا اللہ اکبر جس شخص کی توجہ کا یہ اثر ہے کہ علوم کے دریا قلب میں موجیں مارنے لگیں اور تحمل دشوار ہو جائے تو خود اس شخص کے قلب کی وسعت وقوت کا کیا حال ہوگا۔ جس میں وہ خود علم سمائے ہوں اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کئے ہوئے ہوگا۔

نیز مولانا موصوف نے فرمایا ایک مرتبہ میں نے کسی مسئلہ کے متعلق حضرت قدس سرہٗ سے سوال کیا۔ اس وقت مولاناؒ پر خاص کیفیت طاری تھی۔ اس مسئلہ پر تقریر شروع کی الفاظ بھی غیر مانوس اور غیر مستعمل اور معانی بھی غیر جسے میں کچھ بھی نہ سمجھا۔ میں نے کہا کچھ نازل ہو کر تقریر فرمایئے۔ اس مرتبہ لفظ مانوس مگر معانی غیر مانوس اور قطعاً بلند تھے جسے میں کچھ بھی نہ سمجھا۔ میں نے پھر عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا۔ پھر اس سے اتر کر تقریر فرمائی جو قریب الی الفہم آ گئی۔ مگر میں پھر بھی نہیں سمجھا پھر عرض کیا تو فرمایا مولانا پھر کسی وقت پوچھئے گا —— (امیر الروایات فی عجیب الحکایات)

مکہ معظمہ میں مشہور بزرگ حضرت خلیل پاشا مہاجر مکیؒ نے حضرت حکیم الامتؒ سے ہندی علماء کی تعریف کی کہ ان میں طمع دنیا نہیں ہوتی اور متقی ہوتے ہیں۔ حضرت حکیم الامتؒ نے دریافت کیا کہ کن کن ہندی علماء سے ملنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ کا نام بتایا۔ حضرت حکیم الامتؒ نے دل میں کہا بھلا پھر کیوں نہ تعریف کریں (اشرف السوانح ج ا ص۲۰۳)

حضرت حکیم نواب محمد مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہؒ کی عادت تھی کہ جب حضرات اکابر دیوبند تشریف لاتے تو مراقب ہو کر نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے۔ حضرت نانوتویؒ کی حاضری پر امو جان سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے ہیں، لیکن مولانا کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں (روایات الطیب) حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں رازی اور غزالی پیدا ہونا بند ہو گئے مگر بالکل غلط ہے۔ ہمارے حضرات رازی اور غزالی سے کم نہ تھے، علوم میں بھی کمال میں بھی۔ بات یہ ہے کہ حیات میں قدر نہیں ہوتی۔ مرجانے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ۔ اور پچاس برس گزر جانے کے بعد قدس سرہٗ

ہو جاتے ہیں۔ اور اس تماثل کے معلوم ہونے کا بڑا اچھا معیار ہے۔ ان کی تحقیقات کو بھی دیکھ لیا جائے۔ اس سے بھی معلوم ہو جائے گا۔ (الاضافات الیومیہ ج ۲ صہ ۲۹۹)

مرشدنا حضرت حکیم الامتؒ یہ بھی فرماتے کہ اگر ان کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا جائے اور یہ نہ بتایا جائے کہ کس کی تصنیف ہے تو لوگ امام غزالیؒ اور غزالیؒ کی تصنیف سمجھیں۔

حضرت نانوتویؒ سرسید احمد خاں کی نظر میں | اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ۔ اگرچہ حضرت نانوتویؒ اور سرسید کلاس فیلو تھے۔ دونوں ایک ہی استاد حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ مگر بعد میں سرسیدؒ نے دینی مسائل میں اختراع اور جدت اختیار کی جس سے مسائل میں اختلاف رہا۔ اور یہ اختلاف "مکاتیب بنام سرسیدؒ" کے نام سے چھپا ہے۔ مگر حضرت نانوتویؒ کے انتقال پر سرسیدؒ کے تعزیتی الفاظ مقالات سرسیدؒ سے نقل کئے جاتے ہیں:

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو یا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے، نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہے۔ زمانہ تحصیل میں جیسے کہ وہ ذہانت، عالی دماغی، فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے۔ ویسے نیکی اور خداپرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو نہایت عالی مرتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت تھے۔ اور دوسروں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا انکو خیال تھا۔ مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے مولانا مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اسکی پیروی کرتے تھے۔ انکا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لئے تھا۔ اور کسی سے خوش ہونا بھی خدا کے واسطے تھا۔ کسی کو مولانا موصوف اپنے ذاتی تعلقات کے سبب

اچھا یا برا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ حب للہ اور بغض للہ ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔" (ماخوذ برصغیر کے اسلامی مدارس اور معاشرے پر ان کے اثرات مؤلفہ شمس الاسلام حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم۔ ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ)

حضرت حکیم الامتؒ اور حضرت حجۃ الاسلامؒ | حضرت حکیم الامتؒ کو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حضرت نانوتویؒ کی زیارت کا اکثر موقع ملا۔ لیکن حضرت حکیم الامتؒ کے دیوبند پہنچنے کے ایک سال بعد ہی حضرت حجۃ الاسلام کا انتقال ہوگیا۔ اس لئے خاص خصوصیت پیدا ہونے کا موقع نہ تھا۔ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ تحریر فرماتے ہیں:

" تاہم احقر نے حضرت والاؒ سے بعض ایسے واقعات سنے ہیں جن سے مولانا کی عنایت خاص مترشح ہوتی ہے کیونکہ عادۃً ایسا معاملہ اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ کچھ خصوصیت ہو۔

مثلاً ایک بار از راہِ شفقت دریافت فرمایا کونسی کتابیں پڑھتے ہو۔ حضرت حکیم الامتؒ پر اس قدر رعب و ادب غالب ہوا کہ کتابوں کے نام بھول گئے۔ پھر مولاناؒ نے دوسری باتیں شروع کیں تاکہ ہیبت کا اثر کم ہو جائے۔ اور حضرت حکیم الامتؒ کی طبیعت کھل جائے چنانچہ فرمایا: ایک ہوتا ہے پڑھنا اور ایک گننا۔ محض پڑھنا کافی نہیں گننے کی ضرورت ہے۔ پھر ایک مثال بیان فرمائی۔ ایک حافظِ ہدایہ تھے، مگر سمجھ کر نہ پڑھی تھی۔ جنہوں نے سمجھ کر پڑھی تھی، کہا ایک مسئلہ ہدایہ میں ہے۔ حافظ ہدایہ نے انکار کیا کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں نہیں میں تو ہدایہ کا حافظ ہوں۔ مگر جب دوسروں نے کتاب کھول کر عبارت پڑھ کر استنباط کیا تو حافظ ہدایہ حیران رہ گئے۔ اتنا فرما کر حضرت حکیم الامتؒ سے فرمایا یہ فرق ہے پڑھنے اور گننے میں۔

۲۔ ایک سیاح دیوبند آئے ان کے لڑکے نے چھتہ کی مسجد میں قرآن پاک سنایا اس کے بعد حضرت نانوتویؒ نے حضرت حکیم الامتؒ سے تلاوت کی فرمائش کی جسے حکیم الامتؒ

نے پورا کیا ۔

۳ ۔ حضرت ملا محمود صاحب دیوبندیؒ جو بہت حلیم الطبع تھے ۔ ایک طالب علم پر سخت ناراض ہوئے اور گھونسہ مارا مگر طالب علم کے فوراً اٹھنے کے سبب خود ان کے ہاتھ پر چوٹ آئی جس سے اور غصہ آیا اس لئے مارنے کھڑے ہو گئے ، تو طالب علم بھاگا تو انہوں نے اپنا جوتا اتار کر مارا ۔ حضرت حجۃ الاسلامؒ قریب ہی دیکھ رہے تھے ۔ حضرت حکیم الامتؒ سے دریافت حال کیا ۔ اور فرمایا میں سمجھتا تھا کہ ملا صاحب میں تین عنصر ہیں ۔ آب ، باد ، خاک ۔ چوتھا عنصر نار ہے ہی نہیں ۔ مگر آج معلوم ہوا کہ نہیں چاروں عنصر موجود ہیں ۔ اور واقعہ سن کر بہت ہنسے (اشرف السوانح ج ا ص ۲۲۵)

حضرت حکیم الامتؒ ازراہِ عقیدت اور شوق تحصیل علوم حضرت نانوتویؒ کے درسِ جلالین میں شرکت فرماتے تھے ۔ حالانکہ تقریر اس قدر مشکل ہوتی تھی کہ کچھ سمجھ نہ آتی تھی ۔ (اشرف السوانح ج ا ص ۳۲۶)

چونکہ حضرت حکیم الامتؒ کو حضرت نانوتوی قدس سرہ سے استفادہ و استفاضہ کا کم موقع ملا ۔ اس لئے احقر کو حضرت حکیم الامتؒ کی تصانیف ، مواعظ حسنہ اور ملفوظات میں حضرت نانوتویؒ کے ملفوظات بہت کم ملے ۔ تاہم جو کچھ جمع ہو گئے وہ موتیوں سے کم نہیں ۔　ع　گوہر شناس ہے تو انہیں موتیوں میں تول　　(باقی آئندہ)

جناب محمد محترم فہیم عثمانی ایم۔ اے

تنعّم و عیش کوشی

اسلام کی نظر میں

تنعم و عیش کوشی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی ایسی اغراض کے لئے اپنا مال صرف کرے جنکو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔ مثلاً شراب، زناکاری اور دوسرے محرمات پر مال صرف کرے یا اپنے مال کو جوئے بازی وسٹہ بازی میں لگائے یا محض اظہار ثروت اور دکھاوے کے لئے مال خرچ کرے۔ یہ تمام اغراض چونکہ شریعت اسلامیہ نے بذات خود ممنوع ٹھہرائی ہیں۔ اس لئے ان اغراض کے لئے اپنا مال استعمال کرنا بھی ممنوع ہے۔ تنعم و عیش کوشی کی یہ صورت تو ظاہر ہے۔ محرمات و ممنوعات کی صف میں آتی ہے۔ اور اسلام ان اغراض کے لئے مال کے استعمال کی کسی صورت اجازت نہیں دیتا۔ قانونی طور پر انکے سدباب کیلئے حدود و تعزیرات مقرر کرتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ تنعم و عیش کوشی کی اس صورت کے بارے میں۔ اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے جو شرعی حدود سے تو متجاوز نہ ہو اور جس سے بہرہ اندوز صرف ایسی اغراض پر مال صرف کر کے ہوا جائے جو مباحات کے دائرہ میں آتی ہوں۔ مگر ایسی تنعم و عیش کوشی کے نتیجے میں بھی معاشی ناہمواری جنم لیتی ہو اور قومی دولت کا ضیاع ہوتا ہو۔ شریعت اسلامیہ میں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک دولتمند کو اسلام نے ان مباحات سے لطف اندوز ہونے میں کسی حد کا پابند بھی کیا ہے۔ یا نہیں کیا۔ وہ بالکل آزاد ہے کہ اپنی ساری دولت ان جائز نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں صرف کر دے اور جتنا زیادہ عیش اڑا سکتا ہو اڑائے۔

اسلام نے بنی نوع انسان کے لئے جو ضابطۂ حیات متعین کیا ہے اس میں اس طرز عمل کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ایک آدمی حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے خواہ وہ مباحات

کے دائرہ ہی میں ہو عیش و آرام اور اسکی خاطر کسبِ مال کو عملاً اپنی زندگی کا مقصد بنالے۔ مال و دولت کا مقصد قیامِ حیات ہے مگر خود قیامِ حیات بھی تو کچھ مقاصد کے تحت ہی مطلوب ہے۔ قیامِ حیات کے ضروری اہتمام کے بعد اسلام اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ انسان ان بلند تر مقاصدِ حیات کیطرف توجہ کرے اور اپنے فاضل مال و دولت کو ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے نہ کہ اسے عیش کوشی اور تنعم کی نذر کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عیش و عشرت میں غرق ہو جانے والی زندگی کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اور اس سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ قرآن کریم لذاتِ دنیا میں انہماک اور مبالغہ کی حد تک آرام و سہولت کی طلب سے بھرپور زندگی کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اعلموا انما الحیوٰة الدنیا لعب و	جان لو کہ دنیا (پرستی) کی زندگی لہو و لعب
لهو و زینة و تفاخر بینکم	زینت و آرائش باہمی مفاخرت اور مال و
و تکاثر فی الاموال والاولاد	دولت کے اعتبار سے ایک دوسرے
(الحدید : ۲۰)	سے آگے بڑھنے کی کوشش کا نام ہے۔

اسی قسم کی دنیا پرستانہ زندگی سے اجتناب کی تاکید کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ایاك والتنعّم فان عباد الله	خبردار عیش کوشی سے اجتناب کرو کیونکہ
لیسوا بالمتنعمین ۔	اللہ کے (اچھے) بندے عیش کوش
(مشکوٰة المصابیح باب فضل الفقراء)	نہیں ہوتے۔

دنیا کی لذتوں میں انہماک دراصل انسان کو آخرت سے غافل اور اپنی انفرادی و اجتماعی ذمہ داری کی طرف سے لاپروا بنا دیتا ہے۔ صحابہ کرام اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ کہ امتِ مسلمہ کے تمام افراد عموماً اور ریاستِ اسلامیہ کے اہلِ کار خصوصاً تنعم کی زندگی سے اجتناب کو اپنی عادت بنالیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بار آذربائیجان کے والی کے نام ایک خط میں اسی بات کی خاص تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یا عتبة بن فرقد ایاکم والتنعم	عتبہ بن فرقد خبردار عیش کوشی سے اجتناب
و زیّ اهل الشرك ولبوس الحریر	کرنا اور اہلِ شرک کی پوشاک سے
(سیرة عمر بن خطاب لابن جوزیؒ)	اور ریشم کا لباس پہننے سے۔

غرض اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ تنعم و عیش کوشی کی زندگی کو اسلام ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اور اس سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے مگر یہ سب کچھ تعلیم و ترغیب ہدایت و رہنمائی اور اخلاقی دباؤ تک ہی محدود ہے اصل سوال تو یہ ہے کہ موجودہ معاشرہ میں اخلاقی گرفت اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ محض اخلاقی بنیادوں پر تعلیم و ترغیب کو کافی سمجھتے ہوئے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح لذات میں انہماک کی خواہش لوگوں کے دلوں سے نکل جائے گی اور تنعم بے جا کے نتیجے میں معیشت میں جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کا سدباب ہو جائے گا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ تنعم و عیش کوشی کی ممانعت میں اسلامی قانون کو کس حد تک دخل ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے تنعم و عیش کوشی کی ممانعت میں قانون کو جس حد تک دخل ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے اس حقیقت کی نشاندہی ضروری ہے کہ اخلاقی بنیادوں پر تعلیم و ترغیب کی بے اثری کا شکوہ کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ صورت حال اس معاشرے کی ہے جو مدتوں سے فساد کا شکار ہے اور جس میں انسان کی عملی زندگی کا کوئی گوشہ بھی صحتمند نہیں ہے۔ اسلام انسانی زندگی کے ہر گوشہ کی اصلاح کا علمبردار ہے۔ اسلام کے مثالی معاشرے میں اخلاقی دباؤ کے اثر و نفوذ کی صورت حال اس موجودہ معاشرے سے قطعاً مختلف ہوگی اسلامی معاشرہ ایسے خطوط پر استوار ہوتا ہے کہ افراد معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے احساس ذمہ داری کی ایک ایسی اخلاقی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ شریعت کے وہ مقاصد بھی جن کے حصول کے لئے اسلامی ریاست کو افراد کے حقوق میں مداخلت کا اختیار دیا گیا ہے۔ وہ بھی افراد کے رضاکارانہ عمل سے حاصل ہونے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسلامی ریاست قانون کا سہارا لینے سے پہلے اخلاقی دباؤ کے ذرائع استعمال کرتی ہے جب تک اور جہاں تک اخلاقی طریقوں اور تعلیم و ترغیب کے ذریعہ انفرادی و اجتماعی مقاصد حاصل ہو سکتے ہوں، جبر سے کام نہیں لیتی۔

اخلاقی دباؤ کے تحت تعلیم و تربیت کے طریقہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے ایک طرف تو افراد معاشرہ کی اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور دوسری طرف انفرادی آزادی بھی مجروح نہیں ہوتی جس پر شریعت اسلامیہ کے تمام اوامر و نواہی کا دارومدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ نے بہت سے ایسے مواقع پر جبکہ آپ قانونی طریقے اختیار کر سکتے تھے۔ ترغیب؛

تلقین سے کام لیا اور متعلقہ افراد کو غلط طرزِ عمل ترک کرنے اور مطلوبہ مستحسن رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اسی قسم کا ایک سبق آموز واقعہ حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں :

عن ابی هريرة قال قال رجل يارسول الله ان لی جارا يؤذينی قال انطلق فاخرج متاعك الی الطريق فانطلق فاخرج متاعه فاجتمع الناس اليه فقالوا ما شانك قال ان لی جارا يؤذينی فذكرت للنبی فقال انطلق فاخرج متاعك الی الطريق فجعلوا يقولون اللهم العنه اللهم اخزه فبلغه فاتاه فقال ارجع الی منزلك فوالله لا اوذيك - (الادب المفرد للبخاری ص۲۱)	حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے تکلیف پہنچاتا ہے آپ نے فرمایا جاؤ اور اپنے گھر کا سامان نکال کر سڑک پر ڈال دو وہ آدمی گیا اور اس نے اپنا سامان باہر نکال دیا۔ پھر بہت سے لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا معاملہ ہے اس نے کہا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے تکلیف پہنچاتا ہے ۔ تو میں نے نبی صلعم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور اپنا سامان نکال کر سڑک پر ڈال دو یہ سنکر وہ لوگ

کہنے لگے ۔ یا اللہ اس پر لعنت بھیج ۔ یا اللہ اس کو ذلیل کر اس پڑوسی تک یہ باتیں پہنچیں تو وہ اس آدمی کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تو اپنے گھر میں واپس آجا۔ خدا کی قسم اب میں تجھے تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔

اس واقعہ سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فرد کو دوسرے فرد کی ایذا دہی سے بچانے کیلئے بجائے اس کے کہ کوئی قانونی اقدام فرماتے ایک نفسیاتی طریقہ اختیار کیا اور محض اخلاقی دباؤ سے اصلاح کا مقصد حاصل فرما لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں اسی قسم کی اور متعدد مثالیں موجود ہیں جبکہ آپ نے نہایت حکیمانہ انداز میں رائے عامہ اور اخلاقی دباؤ کے استعمال کے ذریعہ انفرادی و اجتماعی اصلاح کا کام لیا۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ جہاد کی تیاری کے لئے یا بعض اہل حاجت کی حاجت روائی کے لئے مالی امداد کی ضرورت ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد معاشرہ پر کسی قسم کے محاصل وغیرہ عائد کرنے کی بجائے ان سے مالی تعاون کی اپیل فرمائی اور آپ کی اپیل کے نتیجے میں افراد معاشرہ نے اتنا مال حاضر کر دیا کہ ضرورت

پوری ہو گئی۔

غرض اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اخلاقی دباؤ اور رائے عامہ کے دباؤ کو اصلاح کا ذریعہ بنانے کا طریقہ قانونی اقدام اور جبر کے استعمال سے کہیں بہتر ہے۔ رضامندی کے تحت انجام دئیے جانے والے کاموں میں جس حسن وکمال کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ جبر و قہر کے ذریعہ کرائے جانے والے امور میں متوقع نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اجتماعی زندگی میں ضابطہ بندی اور قانون کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ معاشرہ کتنا بھی صالح کیوں نہ ہو۔ افراد کی طبیعتوں کا مختلف ہونا لابدی امر ہے۔ ان میں خیر پسندوں کے ساتھ ساتھ شر پسندوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ افراد کے درمیان علم، پیش بینی، صبر وضبط اور اسی قسم کی دوسری صفات کی کمی زیادتی پر بھی افراد کے غلط یا صحیح طرز عمل اختیار کرنے کا انحصار ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر صرف تعلیم وتربیت اور ترغیب وہدایت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اجتماعی مفادات ومصالح کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ ریاست افراد کے اعمال کی نگراں بن کر رہے —
شریعت مطہرہ کی دور بین نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ جو کام بعض اوقات ترغیب وتلقین کے ذریعہ پورے نہیں ہوتے وہ قوت اور اقتدار کے ذریعہ بآسانی انجام پا جاتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان اللہ لیزعی بالسلطان مالایزعی بالقرآن (سراج الملوک للطرطوشی)　　اللہ سلطان کے ذریعہ ان امور کی نگرانی کر لیتا ہے جنکی نگرانی قرآن کے ذریعہ نہیں کرتا۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عثمانؓ کیطرف بھی منسوب ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

مایزع الامام اکثر ممایزع القرآن (احکام القرآن - قرطبی)　　جتنا کچھ امام (بزور قانون) درست رکھتا ہے وہ اس سے زیادہ ہے جسے قرآن (ترغیب کے ذریعہ) درست رکھتا ہے۔

بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ ترغیب وتلقین کے ذریعہ کاموں کا انجام پا جانا بحیثیت مجموعی ایک بڑی اچھی بات ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افراد معاشرہ اپنی انسانی فطری کمزوری کی بنا پر بسا اوقات غفلت اور کوتاہ بینی کا شکار ہو کر اہم اجتماعی مصالح کے تحفظ سے قاصر رہ جاتے ہیں اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ ریاست اخلاقی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ قانون کی مدد سے بھی افراد کو ان حدود کا پابند بنا کر رکھے جو اجتماعی مفادات و

مصالح کے تحفظ کیلئے وضع کیے گئے ہوں

اب ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ بے جا تنعم و عیش کوشی کے سد باب کے سلسلہ میں اسلامی ریاست کون سے قانونی ذرائع استعمال کرنے کی مجاز ہے اگر ایک شخص مباحات کے دائرہ میں تو رہتا ہے مگر عیش و آرام کی خاطر حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے بے دریغ مال و دولت خرچ کرتا ہے اور اجتماعی مفادات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تو کیا اسلامی فقہ کی رو سے اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قانونی طور پر اس شخص کے مالکانہ تصرفات پر پابندی لگا دے۔

دراصل مباحات، کی حد تک بھی تنعم و عیش کوشی کی زندگی بسر کرنے کے مسئلہ پر جب ہم اس حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں کہ ایسی زندگی کے نتیجے میں فرد کے اپنے مصالح بھی مجروح ہوتے ہیں اور اجتماع کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی نظر میں اس طرح کے غلط اور غیر مفید تصرفات کرنے والا شخص سفیہ اور مفسد قرار پاتا ہے۔ اور سفیہ و مفسد شخص کے مالکانہ تصرفات پر فقہ اسلامی کی رو سے پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ جو شخص عیش کوشی میں محو ہو جاتا ہے۔ وہ مصالح مقاصد زندگی کیلئے اپنا مال اور وقت صرف کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور اسطرح وہ ایسی زندگی گذارتا ہے جو شریعت کی منشاء کے خلاف ہے لذات دنیا میں انہماک انسان کو خواہشات نفسانی کی پیروی کا عادی بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ عقل عامہ بھی اسی بات پر گواہی دیتی ہے کہ ایک بامقصد اور ذمہ دار زندگی میں، اس طرز عمل کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے کہ آدمی اپنی ساری دولت گوناگوں لذائذ دنیوی سے لطف اندوز ہونے میں صرف کر دے اور زندگی کے دیگر بلند تر مقاصد کے حصول کیطرف کوئی توجہ نہ دے۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عیش کوشی میں محو رہنے والا شخص ایسی زندگی گذارتا ہے جو خواہشات نفس کی پیروی کا نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ تقاضائے عقل کے بھی خلاف ہے۔ اور اصلاح جس حیاتگانہ طرز زندگی کا طالب ہے اس کے بھی منافی ہے۔ اور یہی بات فقہ اسلامی میں ایک شخص کو سفیہ قرار دینے کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ ہدایہ کے ایک شارح سید جلال الدین خوارزمی صاحب کفایہ نے "سفہ" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

سفہ شریعت کی منشاء کے خلاف عمل، خواہشات نفس کی پیروی اور تقاضائے

عقل کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ سفیہ کو اخراجات میں تبذیر و اسراف کی عادت ہوتی ہے۔ وہ ایسے تصرفات کرتا ہے جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا یا ایسا مقصد ہوتا ہے جسے دیندار اصحاب عقل معقول مقصد قرار نہیں دیتے۔ مثلاً مغنیوں کو مال دینا یا اڑنے والے کبوتروں کو بھاری قیمت ادا کر کے خریدنا۔ عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا اور نیکی و احسان کے کاموں میں فراخدلی کا مظاہرہ شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہے البتہ (ان کاموں میں بھی) اسراف حرام ہے جسطرح کہ کھانے پینے میں اسراف حرام ہے۔

(کتاب الحجر. باب الحجر للفساد)

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسراف بھی خواہ وہ حاجات ہی کی حدود میں ہو "سفہ" میں داخل ہے۔ اور اسراف کا اطلاق تو فی الواقعی ہوتا ہی ان مصارف پر ہے جو شرعی حدود کے اندر تو رہ کر کئے گئے ہوں۔ مگر ضرورت سے زیادہ اور حد اعتدال سے متجاوز مصارف کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ غیر شرعی مصارف پر مال خرچ کرنے والے کو شریعت کی اصطلاع میں مبذّر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مسرف بھی فقہ اسلامی کی رو سے سفیہ شمار کیا جائے گا اور اس پر بھی حجر کیا جائے گا۔ یعنی اس کے مالکانہ تصرفات پر بھی اسلامی ریاست پابندی عائد کرنے کی مجاز ہوگی۔ اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ تنعم و عیش کوشی کی زندگی گذارنے والا اسراف کا مرتکب ضرور ہوتا ہے۔

تنعم و عیش کوشی کے حصول کی خاطر مال خرچ کرنے کی صرف چار ہی صورتیں ممکن ہیں اور چاروں صورتیں اسراف کے تحت آتی ہیں۔ عیش کوشی کے حصول کی ایک صورت یہ ہے کہ جس غرض کی تکمیل مال کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جاسکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے آدمی اپنے مال کی زائد مقداریں صرف کرتا ہے۔ مثلاً محض نام و نمود اور اپنی دولتمندی کے زعم میں ایک چیز کو بازار سے زیادہ گراں قیمت پر جانتے بوجھتے خریدتا پھرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ضرورت ایک مخصوص وصفی معیار کے حامل سامان سے پوری ہو سکتی ہے۔ مگر عیش کوشی کی زندگی گذارنے والا اسی ضرورت کی تشفی کے لیئے اس سامان سے برتر وصفی معیار کے سامان کا طالب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آمد و رفت کی سہولت، عام معیار کی کاروں "ٹویوٹا" یا "اوپل" وغیرہ کے ذریعہ بھی میسر آسکتی ہے مگر وہ

اسکی خاطر اعلیٰ معیار کی کاریں مرسڈیز یا رولس رائز خریدتا ہے۔ تنعم وعیش کوشی کے حصول کی تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی اہم تر ضروریات کو نظر انداز کر کے غیر اہم امور پر مال صرف کرتا ہے۔ علاج اور علم کا حصول انسان کی بنیادی ضرورتوں میں شمار ہوتے ہیں مگر وہ نظر انداز کر کے اپنے گھر کی زیب وزینت پر بے دریغ دولت خرچ کرتا ہے اور چوتھی صورت عیش کوشی کی یہ ہے کہ اجتماع کے عام معاشی ضرورتوں کی پرواہ کئے بغیر عیش کوشی کی زندگی گذارنے والا اپنے آرام وراحت کی خاطر فضول اخراجات کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے عیش کوشی کے حصول کی خاطر مال صرف کرنے کی یہ چاروں شکلیں اسراف ہی کے تحت آتی ہیں۔ عیش کوشی کا حصول ان چاروں صورتوں کے علاوہ ممکن ہی نہیں گویا اسراف کئے بغیر تنعم وعیش کوشی کی زندگی گذاری ہی نہیں جاسکتی اور جو شخص مسرف ہو وہ محولہ بالا عبارت کی رو سے سفیہ ہے اور سفیہ کے مالی تصرفات پر فقہ اسلامی کی رو سے حجر جائز ہے۔

یہ بات کہ مسرف پر بھی سفیہ کا حکم لگایا جاسکتا ہے سفہ کی اصطلاح کی اس تعریف سے بھی ظاہر ہے جو سرخسی نے المبسوط میں بیان کی ہے۔ سرخسی کے مطابق سفہ کی تعریف یہ ہے کہ:-

> سفہ شریعت کے منشار کے خلاف عمل کا نام ہے وہ خواہشات نفس کی پیروی اور عقل وخرد کے تقاضے کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا اور نیکی واحسان کے کاموں میں فراخ دلی کا مظاہرہ شرعاً پسندیدہ ہے۔ لیکن ان کاموں میں تبذیر واسراف سے کام لینا شریعت اور عرف عام دونوں میں برا ہے۔ (المبسوط جلد ۲۴ صد ۱۵۱)

سفیہ کے مالی تصرفات پر پابندی کے جواز کے اصول پر فقہ اسلامی کے چاروں مکاتب کا اتفاق ہے۔ گو امام ابو حنیفہ رحمہ کسی عاقل وبالغ آزاد مالک پر تبذیر واسراف یا اضاعت مال کی بنا پر حجر کے قائل نہیں، لیکن مختار قول حنفی مکتب فقہ میں بھی حجر کے جواز پر ہی ہے۔ بغرض جمہور فقہائے اسلام تبذیر واسراف اور مال کو ضائع کرنے کی بنا پر اسلامی ریاست کو حق دیتے ہیں کہ وہ ایسے شخص کے مالکانہ تصرفات پر مناسب پابندی لگا دے۔ اس مختصر مضمون میں اسکی گنجائش نہیں کہ اس مسئلہ پر چاروں مکاتب فقہ کی طول طویل بحث کو نقل کیا جائے۔ جو صاحب تحقیق کے خواہاں ہوں وہ "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" لعبد الرحمن الجزیری جلد دوم کے صفحات از ۴۷۸ تا ۴۸۳ مطالعہ فرمالیں۔

سفیہ کے معاملے میں حجر کئے جانے سے متعلق جمہور فقہاء کی اس رائے کا ماخذ قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔

ولاتؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیٰما .... فان آنستم منھم رشدًا فادفعوا الیہم اموالھم

اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو .... پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مالکانہ تصرفات کے لئے رشد ضروری ہے اور رشد فقہاء کی اصطلاح میں مالی تصرفات میں معقولیت کی راہ اختیار کرنے ہی کا نام ہے۔

غرض تنعم و عیش کوشی کے حصول میں اگر کوئی شخص اپنے مال میں ایسے تصرفات کرتا ہے جو مباحات کے دائرہ میں تو ہوں مگر حدِ اعتدال سے متجاوز ہوں۔ اور ان تصرفات سے اس شخص کے ذاتی مفادات مجروح ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی مصالح کو بھی خطرات لاحق ہو رہے ہوں تو اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس شخص کے مالکانہ تصرفات پر مناسب پابندی عائد کر دے۔ اس پابندی کی عملی شکلیں حالات کی مناسبت سے متعین کی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تنعم و عیش کوشی کے عادی حضرات کو اسلامی ریاست بعض مدّات میں اپنا مال صرف کرنے سے بالکل روک دے یا بعض مدّات میں صرفِ مال سے پہلے ریاست کی اجازت کو ضروری قرار دیدے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے افراد کو تمام امور میں صرفِ مال سے پہلے ریاست کی اجازت کا پابند بنا دیا جائے۔

اس سلسلہ میں البتہ ایک بات بڑی اہم ہے وہ یہ کہ عیش کوشی کے مظاہر کی تعین دورِ جدید کی زندگی میں چودہ سو برس پہلے کے پیمانوں سے ناپ کر نہیں کی جا سکتی۔ فنّی ترقی کے اس دور میں وسائلِ معاش کی فراوانی کے باعث معیارِ زندگی میں پہلے کے مقابلہ میں بے حد تبدیلی آگئی ہے البتہ یہ اصول اپنی جگہ برقرار ہے۔ کہ مصارفِ زندگی کے بارے میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہر دور میں مذموم رہا ہے۔ اور آج بھی مذموم ہے۔ اگر افرادِ معاشرہ میں حدِ اعتدال سے تجاوز کا رجحان پایا جائے تو اس کے سدِ باب کیلئے ریاست کو اختیار ہے کہ وہ اخلاقی دباؤ کے ساتھ ساتھ قانونی ذرائع سے بھی کام لے اور مناسب پابندیاں عائد کرے۔ آج کے دور میں

کوئی وجہ نہیں کہ ایک فرد کو اپنے ذاتی استعمال کے لئے متعدد قیمتی کاریں رکھنے سے نہ روکا جائے یا بے دریغ دولت صرف کرکے عالیشان محلات تعمیر کرنے سے منع نہ کیا جائے جبکہ دوسرے افراد معاشرہ اپنی ضرورت کے لئے ایک معمولی سی سائیکل رکھنے اور سر چھپانے کے لئے ایک جھونپڑی بنانے کی بھی ہمت نہ رکھتے ہوں۔

اس تمام بحث سے تنعم وعیش کوشی کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر قارئین پر پوری طرح واضح ہوگیا ہوگا۔ اسلام ہر فرد کو اسکا تو پورا پورا اختیار دیتا ہے کہ وہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے دنیوی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو مگر اس میں بھی حد اعتدال سے تجاوز کو اسلام سخت ناپسندیدہ سمجھتا ہے اور تنعم وعیش کوشی کی ایسی زندگی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے جس کے نتیجے میں افراد کے ذاتی مفادات بھی مجروح ہوتے ہوں اور اجتماعی مصالح کو بھی نقصان پہنچتا ہو۔ اسلام اس قسم کی خطرناک صورتِ حال کے سدباب کے لئے افراد معاشرہ کی اخلاقی بنیادوں پر اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کو اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ وہ اس مقصد کیلئے قانونی ذرائع کو بھی بروئے کار لائے اور ایسے افراد کے مالی تصرفات پر مناسب قانونی پابندیاں عائد کردے جو اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہوں۔

جناب علی محسن صدیقی صاحب استاد تاریخ اسلام
کراچی یونیورسٹی —— کراچی

تعارف کتب حدیث

مسلمانوں نے مختلف وقتوں میں حدیث پر جو کتابیں لکھیں وہ سب کی سب ہم تک نہیں پہنچ سکیں ان کی ایک بہت بڑی تعداد دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی اور ضائع ہوگئی۔ اور ایسا صرف اس لئے نہ ہوا کہ سیاسی ابتلاء اور انتشار نے اسلامی ملکوں کو تھوڑے تھوڑے وقفوں سے برابر اپنی لپیٹ میں رکھا اور خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد طوائف الملوکی پھیلی جس نے بڑی تباہی پھیلائی اور جسکی سب سے بھیانک صورت فتنۂ تاتار تھی۔ بلکہ اسی ضیاع کی ایک وجہ دور انحطاط میں مسلمانوں کی علم حدیث سے غفلت بھی ہے۔ بہرکیف بہت سی ایسی کتابیں جن کو ہم نے ضائع شدہ سمجھ لیا ہے گمنامی کے پردے میں چھپی ہوتی ہیں۔ اور ان کے وجود کے بارے میں کبھی کبھی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ جو کتابیں موجود ہیں ان میں قلمی مخطوطات کی ایک بہت بڑی تعداد محتاج طباعت ہے اس کے باوجود مطبوعہ کتابیں بھی اتنی کثیر التعداد ہیں کہ ان کا استقصاء دشوار ہے۔

اسی طرح احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تعداد کے متعلق بھی قطعی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ شیخ الاسلام حافظ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے جمع الجوامع نامی کتاب میں تمام احادیث کو جمع کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ ایک لاکھ حدیث جمع کر پائے تھے کہ انہوں نے وفات پائی۔ ان کی یہ کتاب نامکمل رہ گئی۔ اسی طرح یہ بھی مروی ہے کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) نے اپنی صحیح بخاری میں جو احادیث تدوین کی ہیں انہیں چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا گیا ہے۔ بہرکیف اس قدر یقینی ہے ——

کہ احادیث مدونہ کی تعداد کئی لاکھ سے متجاوز ہے۔

علمائے حدیث نے کتب احادیث کو "صحت احادیث" ان کے حسن اور ضعف کے اعتبار سے متعدد طبقات میں تقسیم کیا ہے وہ طبقے مندرجہ ذیل ہیں:

طبقۂ اولیٰ | اس طبقے میں وہ کتابیں شامل ہیں جن میں ایسی احادیث مذکور ہیں جو متواتر صحیح احاد اور حسن ہیں۔ یہ کتابیں امام بخاری کی صحیح بخاری، امام مسلم (متوفی ۲۶۱ھ) کی صحیح مسلم اور امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) کی الموطا ہیں۔

طبقۂ ثانیہ | اس میں جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل اور مجتبیٰ نسائی شامل ہیں۔ گو صحت میں یہ کتابیں صحیحین اور موطا، امام مالک کے برابر نہیں ہیں۔ مگر ان کے مدونین نے یہ احادیث بڑی محنت اور اہتمام سے جمع کی ہیں۔ ان میں بعض ضعیف احادیث بھی ہیں۔

طبقۂ ثالثہ | اس طبقہ میں ان کتابوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں مختلف الاقسام ضعیف احادیث مثلاً منکر، شاذ، مضطرب وغیرہ موجود ہیں۔ بعض احادیث کے رجال بھی مجہول ہیں۔ ایسی کتابیں مسند ابن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۹ھ)، مسند طیالسی مسند عبید بن حمید (متوفی ۲۴۹ھ) اور بیہقی، طبرانی، وطحاوی کی کتب ہیں۔

طبقۂ رابعہ | اس طبقے میں بے اعتماد اور ساقط الاعتبار کتابیں شامل ہیں۔ یہ کتابیں بالعموم قصاص (قصہ گو) وعاظ (واعظین) صوفیہ، مؤرخین، غیر عدول، اہل البدعت نے مدون و مرتب کی ہیں۔ مثلاً ابن مردویہ اور ابوحفص، ابن شاہین متوفی ۳۸۵ھ وغیرہ کی کتابیں۔

کتب احادیث کی ایک دوسری تقسیم موضوعات کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ مثلاً کتب صحاح، کتب جوامع مسانید، معاجم، مستدرکات، مستخرجات، اجزاء وغیرہ

کتب صحاح | ان میں حدیث کی مشہور چھ کتابیں شامل ہیں، یعنی امام محمد اسماعیل بخاری کی الجامع الصحیح، امام مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری کی الجامع الصحیح، ابوداؤد سلیمان بن اشعث ازدی سجستانی متوفی ۲۷۵ھ کی سنن، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۵ کی جامع، ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ اور ابوعبداللہ محمد بن یزید

معروف بہ ابن ماجہ متوفی سنہ ۲۷۳ھ کی سنن۔ بعض علمائے حدیث نے سنن ابن ماجہ کی بجائے موطاء امام مالک کو اور بعض نے مسند دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا ہے۔

کتب جوامع | ایسی کتابیں جو حدیث کے مصطلحہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہوں۔ یہ آٹھ ابواب یہ ہیں۔ ۱۔ باب العقائد۔ ۲۔ باب الاحکام۔ ۳۔ باب الرقاق۔ ۴۔ باب آداب الطعام والشراب۔ ۵۔ باب التفسیر والتاریخ والسیر ۶۔ باب السفر والقیام والقعود (باب الشمائل) ۷۔ باب الفتن ۸۔ باب المناقب والمثالب۔ ان مباحث ہشت گانہ پر الگ الگ تصنیفات بھی ہیں۔ مگر کتب جوامع میں یہ تمام مباحث یکجا آگئے ہیں۔ جوامع میں امام بخاری کی الجامع الصحیح اور ترمذی کی جامع مشہور ہیں۔

مسانید | حدیث کی ایسی کتابوں میں جنہیں مسند کہتے ہیں۔ ہر صحابی کی مرویات کو الگ الگ تحریر کیا جاتا ہے۔ صحابہؓ کی ترتیب سبقت الی الاسلام کی بناء پر یا پھر نسبی سلسلہ پر ہوتی ہے۔ ان میں مسند ابی داؤد طیالسی متوفی سنہ ۲۰۴ھ اور مسند امام احمد بن حنبل سنہ ۲۴۱ھ نمایاں ہے۔

معاجم | معجم وہ کتابِ حدیث ہے جس میں حروف تہجی کی ترتیب سے مختلف شیوخ، مختلف شہروں کے رہنے والے رواۃ اور مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے راویوں کی احادیث الگ الگ درج کی جاتی ہیں۔ طبرانی متوفی سنہ ۳۶۰ھ کی المعجم الکبیر، المعجم المتوسط، المعجم الصغیر اور احمد بن علی ہمدانی کی معجم الصحابہ قابلِ ذکر ہیں۔

مستدرکات | کسی کتاب حدیث کے مؤلف کی مقرر کردہ شرائط کے مطابق نئی کتاب کو مستدرکات کہتے ہیں۔ مثلاً حاکم متوفی سنہ ۴۰۵ھ کی مستدرک جو بخاری و مسلم کی مقرر کردہ شروط کے مطابق ایسی احادیث کا مجموعہ ہے جنہیں ان دونوں نے روایت نہیں کیا ہے۔

مستخرجات | مستخرج احادیث کی اس کتاب سے عبارت ہے جس میں کسی مشہور کتابِ حدیث کی احادیث کو اپنی اسناد سے روایت کیا جائے اور صاحبِ کتاب کے ساتھ اس کے شیخ یا اس سے اوپر کے درجہ میں سلسلۂ روایت مل جائے۔ ابوبکر اسماعیلی (متوفی سنہ ۳۷۱ھ) کی مستخرج بخاری ابوعوانہ (متوفی سنہ ۳۱۶ھ) کی مستخرج مسلم، ابوعلی ترمذی کی مستخرج ترمذی، اور محمد بن عبد الملک کی مستخرج سنن ابی داؤد مشہور مستخرجات ہیں۔

اجزاء | جزء وہ تالیف ہے جس میں کسی ایک صحابی یا ایک شیخ کی مرویات کو جمع کر دیا جائے مثلاً جزء ابی بکر جس میں صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایات کردہ احادیث کو مدون کیا گیا ہے اگر کسی خاص موضوع پر کوئی کتاب حدیث مرتب کی جائے تو ایسے بھی جزء ہی کہیں گے۔ مثلاً مروزی متوفی ۲۹۲ھ کی کتاب جزء فی قیام اللیل جس میں شب زندہ داری سے متعلق احادیث کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ان اجزاء میں سیوطی کی جزء فی صلوٰۃ الضحیٰ، ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ کی جزء فی الاخلاص اور شعب الایمان۔ بیہقی متوفی ۴۵۸ھ کی اہم کتابیں ہیں۔

اس کے بعد ہم کتب احادیث کا ایک عام جائزہ پیش کرتے ہیں۔

کتب ائمہ اربعہ | اہل السنت والجماعت کے چاروں ائمہ کرام کی روایات کو بھی یکجا کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی تدوین، توضیح و تشریح کے علاوہ ان کے اسناد کی جانب بھی توجہ کی گئی ہے اور ان کے مراسیل کو اسناد متصلہ سے بیان کیا گیا ہے۔

مسند امام ابو حنیفہؒ | امام ابو حنیفہؒ متوفی ۱۵۰ھ کی جانب جن مسانید کی نسبت کی گئی ہے وہ تعداد میں پندرہ کے قریب ہیں۔ ابو مؤید محمد بن محمود خوارزمی متوفی ۶۵۵ھ نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔ اس مجموعے کا نام جامع المسانید ہے۔

مؤطا امام مالکؒ | امام مالکؒ کی مؤطا دو سلسلوں سے ہم تک پہنچی ہے۔ ایک تو بروایت یحییٰ بن یحییٰ لیثی متوفی ۲۳۴ھ جو مؤطا امام مالک کے نام سے متداول ہے۔ دوسری مؤطا امام محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ کی روایت سے ہے اور مؤطا امام محمد کے نام سے مشہور ہے۔ امام محمد نے اپنی مؤطا میں امام مالک کے علاوہ دوسرے شیوخ کی بھی بعض روایات کو لیا ہے۔ اور بعض فقہی مسائل میں امام مالک کے مسلک سے اختلاف کیا ہے۔ امام مالک کی موطاء کو بعض ائمہ حدیث نے صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔

مسند امام شافعیؒ | جو مسند امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ کی جانب منسوب ہے وہ خود ان کی تالیف نہیں ہے، بلکہ مختلف کتب میں امام نے جن احادیث سے استناد کیا ہے۔ انہیں ان کے شاگرد ربیع بن سلیمان مرادی متوفی ۲۷۰ھ کی روایت سے ابوالعباس محمد بن یعقوب اموی نیشاپوری متوفی ۳۴۶ھ نے یکجا کر دیا ہے۔ اور یہی مجموعہ مسند امام شافعیؒ کے نام سے مشہور ہے۔

مسند امام احمد | امام احمد بن حنبل کی مسند نہایت ضخیم ہے ۔ یہ اٹھارہ مختلف مسانید پر مشتمل ہے ۔ نیز ان کے بیٹے عبد اللہ بن احمد متوفی سنہ ۲۹۰ھ نے اپنے باپ کی روایت پر اضافے بھی کئے ہیں۔ اور انہیں ترتیب دیا ہے مگر یہ مسند حسن ترتیب کی متقاضی ہے

کتب سنن | حدیث کی وہ کتابیں جو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کی جائیں کتب سنن کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں میں مشہور ابوداؤد ، نسائی ، ابن ماجہ ، دارمی ، بیہقی اور دارقطنی کی سنن ہیں۔ ان میں کوئی روایت موقوف نہیں کیونکہ محدثین کی اصطلاح میں موقوف کو حدیث کہا جاتا ہے ، سنن نہیں۔

مصنف | وہ کتابیں جو سنن اس کے مفہوم یا اس سے متعلق مرویات پر مشتمل ہوں مصنف کہلاتی ہیں ایسی کتابوں کو بعض محدثین جامع بھی کہتے ہیں۔ وکیع بن جراح متوفی ۱۹۶ھ اور ابن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ کی مصنف کے علاوہ امام بخاری کی جامع کبیر و جامع صغیر اور امام محمد کی کتاب الآثار اسی زمرے میں داخل ہیں۔ رکن الدین الفراء متوفی ۵۱۶ھ کی شرح السنۃ ، محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ کی تہذیب الآثار ، ابو جعفر طحاوی متوفی ۳۲۱ کی شرح معانی الآثار اور ابوسلیمان الخطابی متوفی ۳۸۸ھ کی کتاب معرفۃ السنن والآثار بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔

کتب تفسیر | تفسیر کی کتابیں جن میں تفسیر قرآن کے ضمن میں احادیث و آثار کو ان کی سندوں کے ساتھ بیان کیا جائے ۔ مثلاً عبد الرحمٰن بن ابی حاتم کی تفسیر جو چار جلدوں پر محتوی ہے ۔ اور جس میں عموماً آثار مسندہ ہیں۔

کتب مصاحف و قرآت | ان کتابوں میں بھی اپنی سندوں کیساتھ احادیث و آثار روایت کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف اور ابوجعفر احمد بن محمد النحاس مرادی متوفی ۳۳۸ھ کی کتاب الوقف والابتداء

کتب دربارۂ ناسخ و منسوخ قرآن یا حدیث | قرآن کے ناسخ و منسوخ پر ابو عبید قاسم بن سلام متوفی ۲۲۴ - ۲۲۲ھ نے کتاب الناسخ والمنسوخ لکھی جس میں احادیث کو اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ حدیث کے ناسخ منسوخ پر امام احمد بن حنبل اور ابوداؤد صاحب سنن ابی داؤد نے کتاب الناسخ والمنسوخ لکھی ہے اسی طرح ابن الجوزی نے ایک مختصر سی کتاب تجرید الاحادیث المنسوخہ لکھی۔

کتب احادیث قدسیہ | حدیث قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جسکی اسناد اللہ تعالیٰ

کیطرف یوں ہو کہ اسے اللہ جل وعلیٰ شانہٗ کے کلام سے بنا دیا جائے، مگر اس سے تحدی نہ مقصود ہو۔ مثلاً ابو الحسن علی بن مفضل مقدسی متوفی ۶۱۱ھ کی الاربعین الالہیۃ، اور محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ کی مشکوٰۃ الانوار۔

کتب مراسیل | مثلاً صاحب السنن ابو داؤد کی کتاب المراسیل جو ابواب کی ترتیب پر ایک جزء ہیں، مدون کی گئی ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم کی کتاب المراسیل ہے جو ابواب ہی پر مرتب کی گئی ہے۔ اسی کتاب کا باب اول اس بیان میں ہے کہ اسانید مرسلہ حجت ہیں یا نہیں۔

کتب فوائد | کتب فوائد میں تمام بن محمد رازی دمشقی متوفی ۴۱۴ھ کی کتاب الفوائد اہم ہے۔ یہ کتاب تیس۳۰ اجزاء میں ہے۔ اسی طرح فوائد ابی بکر محمد بن ابراہیم اصبہانی متوفی ۳۸۱ جو ابن المقری کے نام سے مشہور ہیں آٹھ اجزاء میں ہے۔

کتب شمائل، سیر و مغازی | شمائل نبوی میں ترمذی کی شمائل، ابو محمد حسین بن مسعود البغوی کی کتاب الانوار اور ابو نعیم اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ کی دلائل النبوۃ اہم اور مشہور ہیں۔ قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ اندلسی متوفی ۵۴۴ھ کی کتاب الشفاء بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے مگر انہوں نے ضعیف احادیث بھی درج کی ہیں ——————— بلکہ بعض احادیث کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ موضوع ہیں۔ مشہور تابعی ابو بکر محمد بن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ کی کتاب السیرۃ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اسی طریقہ سے محمد بن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ کی السیرۃ النبویہ سیرت کی اہم کتاب ہے جس میں احادیث واخبار کو اسناد کے التزام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عبد الملک ابن ہشام متوفی ۲۱۸ھ کی السیرۃ النبویہ اور ان کی متعدد شروح جن میں ابو زید عبد الرحمٰن سہیلی متوفی ۵۸۱ھ کی کتاب الروض الانف نہایت اہم ہے۔ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مغازی میں ابن شہاب زہری، محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر واقدی متوفی ۲۰۷ھ کی کتابیں کافی مشہور ہیں۔

کتاب الغرائب | یعنی ایسی کتابیں جن میں کسی مخصوص شیخ کی کتابوں میں مذکور نہ ہونے والی احادیث کو بیان کیا جائے۔ مثلاً دارقطنی کی کتاب غرائب مالک جس میں انہوں نے ان احادیث کو قلم بند کیا ہے۔ جو اس موضوع سے متعلق موطا امام مالک میں نہیں ہیں۔

اس کے بعد ہم ایسی کتب احادیث کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنکی بنیاد آنحضرت اور صحابہ

کتاب کے مابین راویوں کی تعداد پر ہے۔ یعنی مدون اور آنحضرت کے درمیان صرف ایک راوی ہے یا دو یا اس سے زائد۔

وحدانیات | ابو معشر عبدالکریم بن عبدالصمد طبری شافعیؒ نے ایک جزء میں امام ابوحنیفہؒ کی وحدانیات کو جمع کیا ہے۔ ان روایات کو امام نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک واسطے سے روایت کیا ہے۔

ثنایات | دو واسطوں سے صاحب کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث روایت کی ہوں تو ایسی احادیث کو ثنائیات کہتے ہیں۔ امام مالکؒ نے اپنی کتاب الموطا میں ثنائیات درج کی ہیں۔

ثلاثیات | امام بخاریؒ کی ایسی روایتیں جن میں ان کے اور آنحضرت کے درمیان تین واسطے ہیں، بائیس ہیں۔ انہیں حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ وغیرہ نے جمع کیا ہے۔ مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے بھی تین واسطوں سے روایات کی ہیں۔ اسطرح امام احمد بن حنبل کی ثلاثیات کو عقود اللآلی فی الاسانید العوالی میں جمع کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد تین سو سینتیس ہے۔

رباعیات | ایسی روایات جن کے راوی اور صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چار واسطے (رواۃ) ہوں رباعیات کہلاتی ہیں۔ ابوالحسن دارقطنی کی تخریج سے ابوبکر محمد بن عبداللہ شافعی نے امام شافعی کی رباعیات کو ایک ضخیم جزء میں مدون کیا ہے۔ امام بخاریؒ کی رباعیات بھی در الدراری فی شرح رباعیات البخاری کے نام سے علیحدہ جمع کی گئی ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ حدیث کی بھی رباعیات ہیں۔

خماسیات | مسند عراق ابوالحسین احمد بن محمد معروف بہ ابن النقور بغدادی متوفی ۴۷۰ھ کی خماسیات یعنی ایسی حدیثیں جن کے سلسلۂ روایت میں آنحضرتؐ تک پانچ واسطے ہیں۔ جمع کی گئی ہیں سنن دارقطنی سے بھی ایسی احادیث الگ کی گئی ہیں۔

سداسیات | ابو طاہر سلفی متوفی ۵۷۶ھ کی تخریج سے مسند دیار مصریہ ابو عبداللہ محمد بن احمد رازی معروف بہ ابن الحطاب متوفی ۵۲۵ھ کی سداسیات جمع کی گئی ہیں۔ ان میں مسند دیار مصریہ اور رسالت مآبؐ کے درمیان چھ راوی ہیں۔

سباعیات | ایسی حدیثیں جو سات واسطوں سے مروی ہوں۔ ابوالفرج نجیب عبداللطیف

حرانی متوفی ۷۰۶ھ کی ایسی ہی احادیث کو سید شریف عز الدین احمد حسینی نے مرتب کیا ہے

ثمانیات | تحفۃ المستفید فی الاحادیث الثمانیہ الاسانید کے نام سے چار اجزاء میں ابوالحسن یحییٰ بن علی عطار کی ثمانیات (آٹھ واسطوں کی مرویات) مدون کی گئی ہیں۔

تساعیات | نو واسطوں سے متعدد محدثین کی مرویات کو علیحدہ علیحدہ مرتب کیا گیا ہے جن میں قاضی عز الدین ابن جماعۃ شافعی مصری متوفی ۷۶۰ھ کی روایات کے مجموعے کو جن میں ایسی چالیس احادیث ہیں۔ ابوجعفر محمد بن عبداللطیف ربعی متوفی ۷۹۰ھ نے تخریج کیا ہے۔

عشاریات | ترمذی اور نسائی کی روایات میں دس واسطوں سے مروی احادیث بھی ہیں۔ برہان الدین ابو اسحاق تنوخی مصری متوفی ۸۰۰ھ کی بھی عشاریات ہیں

اربعینات | عبداللہ بن مبارک حنظلی متوفی ۱۸۱ھ یا ۱۸۲ھ نے سب سے پہلے اربعینات تصنیف کی ہے۔ اسی طرح ابونعیم اصبہانی ابوعبدالرحمٰن سلمی متوفی ۴۱۲ھ ابوبکر بیہقی اور ابوالحسن دارقطنی کی بھی ایسی مرویات ہیں جو چالیس شیوخ سے روایت کی گئی ہیں اور ان میں سے ہر حدیث کسی ایک صحابی سے سنی گئی ہے۔ اسی طرح تقی الدین محمد بن ا فاسی حسنی متوفی ۸۳۲ھ کی کتاب الاربعون المتباینات ہے

ثمانینات | اسی شیوخ سے ایک ایک حدیث کو ابوبکر آجری متوفی ۳۶۰ھ نے روایت کیا ہے۔

مئینات | سو شیوخ سے ابوالمظفر منصور سمعانی متوفی ۴۸۹ھ نے روایت کیا ہے۔ جسکا نام الامالی ہے۔

راویوں کے حالات، ان کے مختلف طبقات اور ان کے دیگر کوائف سے متعلق بھی بہت سی کتابیں تحریر کی گئی ہیں، ان کا اجمالی ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

مخصوص کتابوں کے راویوں کے حال میں کتابیں | ابوبکر خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ نے مؤطا امام مالک کے راویوں کے حالات میں ایک علیحدہ کتاب لکھی ہے۔

کتب درباره معرفت اسماء، کنیت اور القاب وغیرہ | راویانِ حدیث کے ناموں کنیتوں اور القاب پر امام احمد ابن حنبل کی کتاب الاسماء والکنیٰ اور ابوبکر احمد بن عبدالرحمٰن فارسی شیرازی متوفی ۴۱۱ھ کی کتاب الالقاب وغیرہ اہم کتب ہیں۔

کتاب الانساب | تاج الدین ابوسعید سمعانی متوفی ۵۶۲ھ کی الانساب۔ محب الدین

ابن نجار بغدادی متوفی ۶۴۳ھ کی انساب المحدثین اسی موضوع پر ہیں۔ ان میں راویان حدیث کے انساب سے بحث کی گئی ہے۔

کتب معرفۃ الصحابہ | صحابہ کرام کے حالات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ یا تو حروف تہجی کی ترتیب پر ہیں۔ یا پھر قبائلی ترتیب پر مرتب کی گئی ہیں۔ ابو احمد عسکری متوفی ۲۸۲ھ کی کتاب معرفۃ الصحابہ قبائلی ترتیب پر ہے۔ علی بن مدینی متوفی ۲۳۴ھ کی کتاب معرفۃ من منزلی من الصحابۃ سائر البلدان پانچ اجزاء میں ہے۔ اسی طرح ابونعیم اصبہانی کی معرفۃ الصحابہ تین جلدوں میں ہے۔ ابوعمر بن عبدالبر قرطبی متوفی ۴۶۳ھ کی الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ عزالدین ابن اثیر جزری متوفی ۶۳۰ کی اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ اور ابن حجر کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ اس موضوع کی اہم کتابیں ہیں۔

تاریخ واحوال رجال حدیث | راویان حدیث کے حالات میں امام بخاری نے تاریخ کبیر لکھی جس میں عہد رسالت سے اپنے عہد تک کے راویان حدیث کے حالات تحریر کئے جنکی مجموعی تعداد چالیس ہزار مرد و زن کے قریب ہے۔ اسی ضمن میں ابونعیم اصبہانی کی تاریخ اصبہانی ابوبکر خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد ابن عساکر دمشقی متوفی ۵۷۱ھ کی تاریخ دمشق، حاکم کی تاریخ نیشاپور، ابن ماجہ قزوینی کی تاریخ قزوین۔ محب الدین ابن نجار متوفی ۶۴۳ھ کی الدرۃ الثمینہ فی فضائل المدینہ۔ اور ازرقی متوفی ۲۲۳ کی تاریخ مکہ بھی آتی ہیں۔ محی الدین نووی متوفی ۶۷۶ھ کی تہذیب الاسماء واللغات، عبدالغنی بن عبدالواحد مقدسی متوفی ۶۰۰ھ کی الکمال فی اسماء الرجال، جسکی تہذیب حافظ ابوالحجاج مزی متوفی ۷۴۲ھ نے کی اور جسکا نام تہذیب الکمال فی اسماء الرجال رکھا اور جسکی مختصرات میں ذہبی متوفی ۷۴۸ھ کی تذہیب التہذیب، حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب اور اسکا خلاصہ تقریب التہذیب ہیں، فن رجال کی مشہور و اہم کتب ہیں۔

کتب طبقات | ایسی کتابیں جن میں شیوخ حدیث کے تذکرے اور روایتیں طبقے اور زمانے کی ترتیب سے بیان ہوں۔ ابن سعد کی الطبقات الکبریٰ، ابوحاتم رازی کی طبقات التابعین خلیفہ بن خیاط کی طبقات الرواۃ مشہور کتابیں ہیں۔

کتب مشیخات | ان کتابوں میں مؤلف اپنے ان شیوخ کے حالات جمع کرتا ہے جن سے اس نے ملاقات کی۔ علم حدیث حاصل کیا اور بصورت عدم ملاقات انہوں نے تحریری طور پر اسے روایت حدیث کی اجازت دی۔ حافظ ابویعلیٰ حنبلی کی کتاب المشیخۃ ہشیخ

شہاب الدین سہروردی کی کتاب المشیخۃ وغیرہ اسی سلسلہ کی کتب ہیں۔

کتب وفیات۔ | صحابہؓ اور متاخرین رواۃ کے حالات اور وفات پر لکھی گئی کتابوں میں صاغانی کی درالسحابۃ فی وفیات الصحابۃ، ذہبی کی الاعلام بوفیات الاعلام، اور سمعانی کی تاریخ الوفاۃ للمتاخرین من الرواۃ مشہور ہیں۔

علوم حدیث اور اسکی اصطلاحات پر بھی متعدد کتب تحریر کی گئیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

کتب در بیان علل حدیث | علل حدیث سے مراد یہ ہے کہ گو حدیث بظاہر کسی سقم سے خالی ہو مگر اس میں کوئی ایسا سبب خفی موجود ہو جو اسکی صحت کو مشکوک کر دے، اس موضوع پر بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ نے کتاب العلل لکھیں۔

کتب موضوعات | صحیح احادیث کے معارض موضوع احادیث کی تنقیح پر ابوعبداللہ حسین بن ابراہیم جوزقی ہمدانی ۵۴۳ھ نے کتاب الموضوعات من احادیث المرفوعات لکھی۔ اس کا نام "کتاب الاباطیل" بھی ہے اسی طرح ابو الفرج ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات الکبری ہے جو دو جلدوں میں ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

کتب اختلاف حدیث | یعنی مختلف معارض احادیث کی تاویل اور ان کے مابین تطبیق کے موضوع پہ کتابیں امام شافعیؒ کی کتاب اختلاف الحدیث جو ربیع بن سلیمان مرادی نے روایت کی ہے۔ اسی موضوع پر ہے۔ اسی موضوع پر محمد بن جریر طبری نے بھی کتاب لکھی ہے۔

کتب آداب و قوانین روایت | خطیب بغدادی نے الجامع لاخلاق الراوی والسامع لکھی۔ انہیں کی ایک اور کتاب الکفایۃ فی اصول علم الروایۃ بھی ہے۔

کتب اصطلاحات حدیث | اصطلاحات حدیث پر سب سے پہلے حافظ ابومحمد ابن خلاد رامہرمزی متوفی ۳۶۰ھ (تقریباً) نے کتاب لکھی۔ لیکن اسی کتاب میں تمام اصطلاحات کا استیعاب نہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد حافظ ابوحمید اللہ حاکم نے حدیث کی پچاس ۵۰ انواع کا ذکر کیا مگر ان کا یہ بیان بھی مکمل نہ تھا۔ اس لئے حافظ ابوعمر وعثمان ابن صلاح متوفی ۶۴۳ھ یا ۶۴۶ھ نے اپنی کتاب علوم الحدیث میں ۶۵ اقسام حدیث کا ذکر کیا اور انہیں آراستہ و پیراستہ کیا۔ ابن صلاح کی یہ کتاب مرجع خواص وعوام ہوگئی۔ اور اسکی مختصرات، مستدرکات لکھی

گئیں، بعض لوگوں نے اسے نظم کیا۔ اس پر اعتراضات بھی کئے گئے اور پھر ان کے جوابات بھی۔ ابن حجر کی کتاب الافصاح اسی زمرے کی کتاب ہے جس میں ابن اصلاح کے مباحث کی وضاحت کی گئی ہے۔

اصول حدیث کی دوسری مشہور کتاب جسکی جانب بہت زیادہ توجہ کی گئی حافظ ابن حجر کی نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر ہے۔ ابن حجر ہی نے اسکی شرح نزہتہ النظر کے نام سے لکھی۔ ان کے بیٹے کمال الدین نے اسکی شرح نزہتہ النظر کے نام سے تحریر کی۔ شیخ ابو الحسن محمد صادق سندھی متوفی ۱۱۳۸ھ نے بھی نخبۃ الفکر کی شرح لکھی اسی طرح سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ نے مختصر جامع المعرفۃ علوم حدیث لکھی۔ اسکی شرح مولانا عبد الحئی فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ نے کی جسکا نام ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ مشہور کتب حدیث کی ضخیم شروح کو شمار کیا جائے تو یہ داستان بہت طویل ہو جائے گی۔ اسی طرح اور بھی متعدد موضوعات ہیں جن پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ احادیث کی کتابوں کے ترجموں کا تذکرہ بھی ضروری تھا مگر ان کے لئے بھی ایک دفتر چاہیئے۔ اس ذکر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ یہاں افسانہ از افسانہ می خیزد والی بات ہے۔ اسے سمیٹنا مشکل ہے۔ اس لئے ہم اس گفتگو کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ ■■

بقیہ : درس قرآن —— ارشاد فرمادیں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ توبہ کریں کہ ایمان بھی ہو (یعنی ایمان لاویں) آگے ان ربک میں انہ اور لغفور میں لام اور اپنی دو صفات غفور اور رحیم بیان فرما دیں۔ جسکا معنی یہ ہے کہ ضرور ضرور ضرور توبہ کے بعد معاف فرما دیتے ہیں لیکن حقوق العباد نہیں معاف ہوتے۔ انکی توبہ یہ ہے کہ انکو ادا کرے، نماز قضا کو ادا کرنا وغیرہ تو یہ ہے طریق توبہ کا۔ اس طریق پر توبہ کرنے سے لغفور معاف کر دیا۔ اور رحیم کا معنی یہ ہے کہ جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کریں گے یہ انعام ہے ورنہ ایک ہی گناہ ابد الاباد جہنم میں رہنے کیلئے کافی تھا تو ہم جہنم سے بھی نکالیں گے یہ تو صفت غفور کا اثر ہے اور جنت میں داخل کریں گے یہ صفت رحیم کا اثر ہے۔ حضور کا ارشاد ہے کہ ستر مرتبہ گناہ ہو جائے ستر دفعہ توبہ کرو۔ ۷۰ دفعہ اللہ تعالیٰ معاف کرتے ہیں اور ۷۰ کے عدد سے کثرت مراد ہے چاہے ۷۰ کروڑ مرتبہ گناہ کرکے توبہ کرے پھر بھی معاف فرماتے ہیں۔ لیکن شریر طبیعت والے اسکو سن کر اور جری ہو جاتے ہیں۔ اور گناہ کی جرأت کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے تریاق کے معلوم کرنے کے بعد زہر کھانے لگے۔ اس لئے توبہ کے بھروسہ پر تو گناہ نہ کرے البتہ اگر غلطی سے ہو جائے، توبہ کرلے۔ ■■

مولانا مبارک علیؒ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

بنام شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ'

تبرکات و نوادر

بملاحظہ محترم المقام مولانا عبدالحق صاحب زید مجدہ'

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' ـــ عرصہ سے آپ نے سلسلہ خط و کتابت بند کر رکھا ہے۔ پچھلے دنوں جو خطوط حضرت مہتمم صاحب کے پاس آتے رہے ان سے آپ کی خیریت معلوم ہوتی رہی، عرصہ ہوا آپ نے مطلع فرمایا تھا کہ فرغل یعنی کشمیری گرم چوغہ حاصل کر لیا گیا کسی جانے والے کے ہاتھ روانہ کروں گا۔ چونکہ موسم سرما شروع ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کی یاد دہانی کر رہا ہوں۔ جلد از جلد بھیج کر ممنون فرمائیں۔

میں تقریباً ڈیڑھ ماہ تک سخت علیل رہا۔ بفضلہ تعالیٰ اب اچھا ہوں۔ میں دو تین ماہ میں بشرط حیات انشاء اللہ تعالیٰ بچوں سے ملاقات کے لئے پکڈال کی حاضری کا ارادہ کئے ہوں۔ کیا عجب ہے آپ سے بھی کسی جگہ ملاقات نصیب ہو جاوے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ جواب باصواب کا منتظر ہوں۔ والسلام۔ ۱۰ر صفر المظفر ۱۳۷۳ھ

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم۔ گرامی نامہ موسومہ حضرت مہتمم صاحب صادر ہوا حضرت ممدوح کلکتہ تشریف لے گئے ہیں۔ اواخر رمضان میں واپسی متوقع ہے۔ وسط شوال میں سفر حج کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ اس لئے پاکستان کے سفر کا کوئی امکان نہیں ہے آپ کو حضرت مہتمم صاحب کے پروگرام کی اطلاع صحیح نہیں ملی۔ اطلاعاً عرض ہے۔ والسلام۔ ۱۴ - ۹ - ۱۳۷۹ھ

حضرت محترم زیدت معالیکم -
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' - مزاج گرامی - گذشتہ ماہ میں جناب کی خدمت میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کا ایک مقالہ موسومہ علماء دیوبند کا مسلک " حصول رائے کے لئے ارسال کیا گیا تھا. اس مضمون کی اشاعت میں بمصالح عدیدہ عجلت کی ضرورت ہے اس لئے تاریخ وصولیابی سے پندرہ بیس دن کے اندر اندر رائے گرامی بھیج دینے کی استدعا کی گئی تھی. لیکن ارسال مقالہ پر کافی عرصہ گذر چکا ہے. اور اس سلسلہ میں ہنوز دفتر جناب کے تبصرے سے محروم ہے. اس لئے بطور یاد دہانی یہ عریضہ ارسال ہے امید ہے کہ پہلی فرصت میں مطبوعہ مقالہ پر شائع شدہ تنقیدیں اور مجموعہ مقالہ پر اظہار خیال فرما کر ممنون فرماویں گے. زیادہ تاخیر میں جناب کی مؤقر رائے شائع نہ ہونے کا افسوس رہ جائے گا.
امید ہے کہ مزاج سامی بعافیت ہوگا. والسلام - ۱۴ - ۱ - ۱۳۸۴ھ

محترم المقام زید مجدکم السامی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' - گرامی نامہ نے مشرف فرمایا حضرت مہتمم صاحب کا پتہ آپ نے دریافت فرمایا ہے. لہذا پتہ یہ ہے .... حضرت ممدوح امید ہے کہ آخر فروری یا انشاء اللہ شروع مارچ میں واپس تشریف لے آویں گے اگر شعبان میں مغربی پاکستان جانا طے ہوا تو انشاء اللہ پروگرام میں آپ کے لئے بھی تاریخ ضرور لکھوا دی جائے گی مطمئن رہیں. احقر کو بھی جناب والا نے شرکت جلسہ کی دعوت دی ہے. بہت بہت شکریہ. مگر یہ تو خیال فرمائیے کہ میری حاضری میں بجز اس کے کہ دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث ہو اور کیا ہے. نہ وعظ نہ تقریر نہ کچھ نہ کچھ. خیر یہ آپ کی محبت کی بات ہے. کہ آپ نے اس موقع پر اس ناچیز اور ناکارہ کو یاد فرمایا. بہت بہت شکر گذار ہوں اور دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے مدرسہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرما دے اور طلبہ آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے رہیں. والسلام. ۶ - ۷ - ۱۳۷۶ھ

محترم المقام زاد مجدکم
السلام علیکم - گرامی نامہ نے مشرف فرمایا. یاد فرمائی کا شکر گذار ہوں. مدرسہ کی ترقی

سے دلی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ مزید ترقی عطا فرمائے۔ حضرت مہتمم صاحب۔ آج کل سفر پہ ہیں
رنگون تشریف لے گئے ہیں۔ ایک ڈیڑھ ماہ میں واپسی ہوگی۔ سال گذشتہ ماہ ربیع الثانی
۱۳۷۵ھ جب احقر نبیرۂ خود سید منظر السبطین مرحوم (پسر ہیڈ ماسٹر سید مسعود السبطین) کے
سانحۂ ارتحال کی اطلاع پاکر جب چکوال ضلع جہلم گیا تھا، تو اس وقت کئی مرتبہ ارادہ کیا
کہ آپ کو چکوال بلاؤں مگر نہ بلا سکا اور نہ چکوال میں حاضری کی اطلاع دے سکا۔ کیونکہ خیال
ہوا کہ شاید اپنے مشاغل کیوجہ سے چکوال نہ آسکیں اور پہلے کیطرح مجھ کو حاضری[۴] کا حکم دیں۔
اور میں اس وقت اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے نیز وقت میں گنجائش نہ ہونے کیوجہ
سے حاضری نہیں دے سکتا تھا اور باوجود شدید اشتیاق ملاقات کے کچھ نہ کر سکا یعنی نہ
آپ کو چکوال کے لئے دعوت دے سکا۔ اور نہ اپنی حاضری کی اطلاع دے سکا۔ آپ
کے مدرسہ کی ترقیات کو سن کر بہت مسرت ہوتی ہے۔ یہ آپ کے خلوص نیت اور محنت
کا ثمرہ ہے اللّٰھم زد فزد حضرت قبلہ مولانا مدنی مدظلہٗ کو آپ کا خط ملاحظہ کرا دیا تھا اور
دعا کیلئے عرض کر دیا تھا حضرت ممدوح نے سلام لکھنے کا ایما فرمایا تھا۔ لہٰذا ممدوح کا سلام
عرض کرتا ہوں اپنی خیریت سے گاہ بگاہ مطلع فرماتے رہیں۔ یہ نصف ملاقات کا درجہ ہے
خدا کرے کہ آپ سے جسمانی ملاقات کی بھی کوئی صورت پیدا فرما دیں۔ والسلام۔ ۳۰ جمادی الاول ۱۳۷۶ھ

محترم المقام زید مجدکم۔ سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ نے ممنون یاد آوری فرمایا۔
بہت عرصہ کے بعد خیریت مزاج معلوم ہو کر بے حد خوشی اور مسرت ہوئی۔ " دار العلوم کی
صد سالہ تاریخ[۵] کی روانگی کی اطلاع کے سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب کا والا نامہ ملاحظہ سے
گزر چکا ہوگا۔ اور مذکورہ بالا کتاب بھی پہنچ گئی ہو گی۔ نقل سند (مولوی فضل حق صاحب) کے
بارہ میں تعلیمات سے جواب کافی تاخیر سے آیا ہے۔ اس لئے ارسال عریضہ میں جو تاخیر ہوئی
اس کیلئے معذرت خواہ ہوں ------- امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ والسلام ۳/۸۶

۱؎ اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مرحوم کے سانحۂ ارتحال پہ تعزیتی مضمون اور سفر آخرت پر مشتمل طویل مکتوب ہے۔ جو الحق ماہ دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہو چکا ہے ۲؎ بعد میں یہی گرانمایہ مقالہ اسی نام سے متعدد جگہ شائع ہوا۔

۳؎ دار العلوم حقانیہ کا جلسۂ دستار بندی جس میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ نے شمولیت فرمائی ۴؎ پہلی دفعہ پاکستان آمد پہ صاحب مکتوبات اکوڑہ خٹک تشریف لائے اور دو تین یوم قیام فرمایا تھا۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔

۵؎ مرتبۂ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی مدظلہٗ۔

REGD—L NO. 7681

طبوعہ عام ادوس پشاور